رحمٰن عباس کی تخلیقات اور تصنیفات کا تجزیاتی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی

مقالہ نگار

پرتاپ سنگھ

نگراں

ڈاکٹر فرحت شمیم

شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں توی، ۱۸۰۰۰۶

۲۰۲۳ء

Rahman Abbas ki Takhleeqat-o-Tasneefat ka Tajziati Mutalia

A Thesis
Submitted to the University of Jammu
for the award of
Doctorate of Philosophy in Urdu

Submitted by
Partap Singh

Supervisor
Dr. Farhat Shamim

DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF JAMMU - 180006
2023

POST GRADUATE DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF JAMMU, JAMMU, 180006

CERTIFICATE

This is to certify that Partap Singh**,** Ph.D. Scholar, Department of Urdu has carried out research work entitled Rahman Abbas ki Takhleeqat-o-Tasneefat ka Tajziati Mutalia under my supervision for the award of the degree of Doctor of Philosophy in Urdu, University of Jammu.

It is further certified that:

a) The thesis embodies the work done by the candidate himself. It is original and not copied from any other source.

b) The candidate has worked under my supervision for the period required under statutes.

c) The candidate has put in the required attendance in the department during the period of research.

d) The candidate has fulfilled all the requirements of the UGC-MSP-2016 regulation.

e) The candidate has fulfilled the statutory conditions as laid down in Section 18 of statutes governing the degree of Doctor of Philosophy.

Prof. Mohd Reyaz Ahmed
H.O.D. Urdu
University of Jammu

Dr.Farhat Shamim
(Supervisor)

PLAGIARISM CERTIFICATE

I,Partap Singh, S/o Sh. Rattan Singh hereby declare that the work reported in this thesis entitled Rahman Abbas ki Takhleeqat-o-Tasneefat ka Tajziati Mutalia is original and has not been copied from any other sources without due acknowledgement and has 0% percent degree of similarity as per Original Analysis Result. The work has no plagiarism beyond the permissible limit and the work has not been submitted for the award of any other degree/diploma of the same institution where the work was carried out, or to any other institution.

Partap Singh
(Research Scholar)

Dated:_______/_______/2023

Prof. Mohd Reyaz Ahmed
H.O.D. Urdu
University of Jammu

Dr. Farhat Shamim
(Supervisor)

DrillBit

The Report is Generated by DrillBit Plagiarism Detection Software

Selected Language Urdu

Submission Information

Author Name	Partap Singh
Title	Ph.D
Paper/Submission ID	1108173
Submission Date	2023-11-16 13:18:11
Document type	Thesis

Result Information

Similarity	**0%**

A Unique QR Code use to View/Download/Share Pdf File

16/11/23

16/11/23

16/11/2023

Head,
Department of Urdu,
University of Jammu,
Jammu.

16/11/23

DRC
1
2
3
4

DECLARATION

I Partap Singh, S/o Sh. Rattan Singh hereby declare that the work reported in this thesis entitle Rahman Abbas ki Takhleeqat-o-Tasneefat ka Tajziati Mutalia is original and has not been copied from other sources without due acknowledgement.

Partap Singh

Dated:______/_______/2023 (Research Scholar)

Prof. Mohd. Reyaz Ahmed
H.O.D. Urdu
University of Jammu

Dr. Farhat Shamim
(Supervisor)

فہرست

تلخیص

رحمٰن عباس کی تخلیقات اور تصنیفات کا تجزیاتی مطالعہ

تحقیقی مقالہ برائے پی، ایچ۔ڈی

نگراں	مقالہ نگار
ڈاکٹر فرحت شمیم	پرتاپ سنگھ

شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں توی، ۱۸۰۰۰۶

۲۰۲۳ء

کہانی نے اپنے ارتقائی سفر میں کئی رنگ و روپ بدلے اس کی ابتدائی شکل داستان کہلائی جہاں کہانی میں فوق الفطری عناصر کی بھرمار نظر آتی ہے لیکن جب قصے نے ناول کا روپ اختیار کیا تو فوق الفطری عناصر کی جگہ زندگی کی حقیقت نے لے لی اس طرح ناول زندگی کی تفسیر اور ترجمان بن کر اُبھرا۔اس ضمن میں پہلا نام نذیر احمد کا ہے جنہوں نے ''مراۃ العروس'' لکھ کر ناول کی بنیاد ڈالی۔ناول نے اپنے ارتقائی سفر میں کہیں اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن کسی بھی ادوار میں سماج اور زندگی سے اس کا تعلق نہیں ٹوٹا ہاں اتنا ضرور ہے کہ موضوع، ہیت ،تکنیک اور اسلوب کی سطح پر کافی تبدیلیاں ائیں بالخصوص ۱۹۸۰ء کے بعد ناول ایک نئے منظر نامے کے ساتھ سامنے آیا۔۱۹۸۰ء کے بعد لکھنے والوں کی جونئی پود اُبھر کر سامنے آئی ان میں رحمٰن عباس کا نام اہمیت کا حامل ہے جنہوں نے اپنی تخلیقات بالخصوص ناول کے ذریعے بدلتی ہوئی قدروں، سماج کی دم توڑتی ہوئی روایات ،جنسی ہیجان، نفسیاتی کشمکش اور مذہبی انتہا پسندی کو بیان کیا ہے ساتھ ہی انہوں نے گذشتہ تین دہائیوں میں ناول میں جو تبدیلیاں موضوعات ،تصورات اور تکنیک کی سطح پر آئی ہیں انہیں بھی قبول کیا ہے۔ رحمٰن عباس کا نام ان معنوں میں بھی اہم ہے کہ انہوں نے نڈر ہو کر بڑی صاف گوئی کے ساتھ معاشرتی مسائل کی ترجمانی کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تخلیقات کو تنقید کا نشانہ بھی بنایا گیا باوجود اس کے وہ مسلسل لکھتے رہے ان کے یہاں مذہبی کٹر پن اور لبرل تصورات کے درمیان کی کشمکش سے الجھنے والی نئی نسل ہے جو ایک طرف سیاسی، سماجی اور اقتصادی بحران کا شکار ہے تو وہیں دوسری طرف یہ نسل اپنے وجود کے تئیں بھی تذبذب میں مبتلا نظر آتی ہے یہ تذبذب فنکار کی تخلیقات میں بھی صاف عیاں ہے۔رحمٰن عباس کا کمال یہ ہے کہ یہ کسی بھی نظریے کی تقلید کرتے بلکہ وہ سنجیدہ فنکار کی طرح سماجی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مذہبی انتہا پسندی کے خلاف تنقید دیکھنے کو ملتی ہے۔

اکیسویں صدی میں ناول ایک نئے منظر نامے کے ساتھ سامنے آیا موضوعاتی اور تکنیکی اعتبار سے معاصر ناول میں نئے تجربے سامنے آئے رحمٰن عباس نے بھی اپنے ناولوں میں فنی اور موضوعاتی سطح پر تجربات کیے۔ بیان کی سادگی، کہانی پن، علامت اور استعاروں کے استعمال نے ان کی کہانیوں میں وسعت بخشی ہے یہی وجہ ہے کہ معاصر اردو ناول میں ان کا اپنا ایک الگ مقام ہے ساتھ ہی ان کے ناولوں میں موضوعاتی سطح پر کافی تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔عصر حاضر میں اقلیتوں کے مسائل، سیاسی بدعنوانیاں ،فرقہ واریت اور مذہبی شدت پسندی کے مسائل جس طرح عروج پا رہے ہیں رحمٰن عباس نے اپنے ناولوں کے ذریعے اس کے منفی اثرات سے بھرپور واقف کرایا ہے۔

رحمٰن عباس کے آبا و اجداد مہاراشٹرا کے ایک ساحلی علاقے کوکن کے رہنے والے تھے۔ جو وہاں کھیتی باڑی کا کام کیا کرتے تھے۔کوکن علاقے میں ہی ان کے دادا تولد ہوئے اور بعد میں ان کے والد صاحب کی بھی پیدائش کوکن میں

ہوئی ۔رحمٰن عباس کا جنم بھی ۳۰ جنوری ۱۹۷۲ء کو کوکن ،مہاراشٹر میں ہی ہوا۔ان کے والد کا نام عباس محمد دھامسکر اور والدہ کا مریم عباس ہے۔ان کے والد ممبئی کے ایک کلب میں کام کرتے تھے رحمان عباس کے والدین کی چار اولادیں ہوئی رحمان عباس اپنے والدین کی دوسری اولاد ہیں۔رحمٰن عباس کی ابتدائی تعلیم کا سفر مہاراشٹر سے شروع ہوا۔ پرائمری درجے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد رحمٰن عباس نے مرول اردو ہائی اسکول میں داخلہ لیا۔اس کے بعد ۱۹۹۴ء میں گورنمنٹ کالج مہاراشٹر سے بی ۔اے کا امتحان اچھے نمبرات سے پاس کیا اور پھر ۱۹۹۶ء میں ایم ۔اے ۔اردو کی سند ممئی یونیورسٹی سے حاصل کی ۔ اپنے تعلیمی سفر کو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے ۲۰۰۱ء میں ممبئی یونی ورسٹی سے ہی بی ۔ایڈ (B.Ed) کا امتحان پاس کیا۔ممئی یونی ورسٹی میں رحمٰن عباس کے تعلیمی سفر کو اور زیادہ تقویت ملی اور انہوں نے یہاں ہی سے ۲۰۰۵ء میں ایم ۔اے انگریزی کی ڈگری حاصل کی ۔۲۰۱۲ء میں رحمٰن عباس نے مراٹھواڑہ یونی ورسٹی مہاراشٹر سے ایم ۔ایڈ (M.Ed) کا امتحان پاس کیا۔

رحمٰن عباس ۲۰۰۱ء میں ممبئی میں زاہدہ پروین سے رشتہ ازدواج میں بندھ گئے ۔لیکن ۲۰۱۰ء میں زاہدہ پروین کا انتقال ہوگیا جس کی وجہ سے انہوں نے دوسری شادی ۲۰۱۱ء میں نرگس سے کی ۔دونوں کی ازدواجی زندگی بڑی خوش گوار رہی ہے ۔رحمٰن عباس کے ہاں دو بچے پیدا ہوئے ۔پہلی لڑکی ،جس کا نام ماہرہ ہے جو ابھی چوتھی جماعت میں زیر تعلیم ہے اور ایک لڑکا جس کا نام رومی ہے جو دوسری جماعت میں پڑھتا ہے ۔

رحمٰن عباس کے ادبی سفر کا باقاعدہ آغاز ''گابو کی بکری'' عنوان کے ایک افسانے سے ہوا جو رسالہ ''شب خون'' میں ۱۹۹۸ء میں شائع ہوا۔اس وقت رحمٰن عباس کی عمر ۲۶ سال تھی ۔شروع میں وہ افسانے کی طرف رغبت رکھتے تھے لیکن بعد میں جب ناول کا مطالعہ کیا تو ناول سے زیادہ متاثر ہوئے اور انہوں نے اپنے تخلیقی ذہن کو ناول لکھنے کی طرف مائل کیا اور اس کوشش میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہوئے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کے اب تک پانچ ناول شائع ہو چکے ہیں ۔ رحمٰن عباس کا کل ادبی سرمایہ نثر پر مشتمل ہے ان کے یہاں پانچ ناولوں کے علاوہ ناول کی تنقید کے حوالے سے ایک تصنیف بعنوان'' اکیسویں صدی میں اردو ناول'' منظر عام پر آ چکی ہے ساتھ ہی انہوں نے ایک مونوگراف ساجد رشید کی زندگی کے متعلق بھی تحریر کیا ہے۔ان کی اب تک جو پانچ ناول منظر عام پر آ چکے ہیں ان کے نام یوں ہیں نخلستان کی تلاش میں،ایک ممنوعہ محبت کی کہانی،خدا کے سائے میں آنکھ مچولی،روحزن اور زندیق شامل ہے۔

زیر نظر تحقیقی مقالہ ''رحمٰن عباس کی تخلیقات اور تصنیفات کا تجزیاتی مطالعہ'' کو پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے۔

مقالے کا پہلا باب رحمٰن عباس ایک تعارف کے حوالے سے ہے۔جس کے تین ذیلی حصے ہیں یہ تین ذیلی حصے دراصل رحمٰن عباس کی شخصیت کے متعلق ہیں۔ پہلے ذیلی حصے میں خاندانی پس منظر کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔دوسرے ذیلی حصے میں تعلیم وتربیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی گئی ہے۔تیسرا ذیلی حصہ ان کی ازدواجی زندگی پر مشتمل ہے۔

مقالے کا دوسرا باب ۱۹۸۰ء کے بعد اردو ناول ایک جائزہ ہے یہ باب دو ذیلی حصوں پر مبنی ہے پہلے ذیلی حصے میں ناول کے اسلوب کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے تو وہیں دوسرے ذیلی حصے میں نئے لکھنے والوں نے موضوعاتی اعتبار سے ناول میں جو کچھ پیش کیا اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔دراصل ۱۹۸۰ سے لے کر اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک عالمی سطح پر جو انتشار دیکھنے کو ملتا ہے اس نے تمام زبانوں کے ادب کو متاثر کیا ہے جہاں تک اردو ناول کا سوال ہے ناول پر بھی اس کے گہرے اثرات پڑے۔سیاسی تصادم،معاشی بدحالی،قومیت کا تصور،کٹر پن، اخلاقی قدروں کا زوال کے ساتھ ساتھ اکیسویں صدی کا چیلنج نے لکھنے والوں کو خوب متاثر کیا یہی وجہ ہے کہ کہانی میں موضوعاتی،ہیئتی، تکنیکی اور اسلوب کی سطح پر تبدیلی آنا لازمی تھا دراصل معاصر اردو ناول میں نئے نئے تجربات دیکھنے کو ملتے ہیں یہ نئے تجربات موضوعاتی سطح پر بھی نظر آتے ہیں، ان میں بیان کی سادگی کے ساتھ ساتھ کہانی پن بدرجہ اُتم نظر آتا ہے ساتھ ہی علامتوں کے استعمال سے ناول کے اسلوب میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔نئے لکھنے والوں نے جدید زندگی کے ہر پہلو کو بیان کیا ہے ساتھ ہی جدید زندگی کے سبب فرد اپنی روایتی قدروں سے انحراف کرتے ہوئے اگے بڑھتا جا رہا ہے لیکن وہیں جدید زندگی نئی نسل کو بے شمار نئے مسائل سے واقف بھی کرا رہی ہے جن میں سب سے بڑا سنجیدہ مسئلہ انسانی وجود کا ہے جو قومیت، مذہب، رنگ و نسل،فرقہ واریت اور کٹر پن کے بھنور میں پھنس کر الجھتا ہی جا رہا ہے۔اس ضمن میں عبدالصمد،حسین الحق، یعقوب یاور،مشرف عالم ذوقی،صادقہ نواب سحر،شموئل احمد،ترنم ریاض،زاہدہ زیدی وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں جنہوں نے اپنے ناولوں میں اس بحران کو بڑی سنجیدگی سے بیان کیا ہے۔ان ناولوں میں مرد اور عورت کے درمیان رشتوں کی کشیدگی،جنسی ہیجان اور نفسیاتی کشمکش کا اظہار نظر آتا ہے۔شموئل احمد کا ناول ''ندی'' اس کی عمدہ مثال ہے۔یہ ناول جنسی نفسیات پر مبنی ہے۔اس ناول میں انہوں نے بدلتے ہوئے سماج میں عورت اور مرد کے آپسی رشتے کو موضوع بنایا ہے۔اس میں انہوں نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ عورت ایک ندی ہے جو کسی طرح کی رکاوٹ اور پابندی کو برداشت نہیں کر سکتی ہے ۔اس ناول میں انہوں نے عورت کی نفسیاتی کشمکش کو پیش کیا ہے کہ کس طرح عورت شادی کی پہلی رات سے ہی مرد کے ساتھ ایڈجسٹ کر رہی ہے۔''مہاماری'' ان کا دوسرا ناول ہے۔اس کا موضوع ''Corruption'' ہے۔اس میں شموئل احمد نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کرپشن کی مہاماری ہر طرف پھیل گئی ہے اور ہم سیاسی نظام کے خلاف سوائے احتجاج کے اور کیا کر سکتے ہیں۔

شموئل احمد کے علاوہ عبدالصمد، مشرف عالم ذوقی، صادقہ نواب سحر اور حسین الحق بھی اپنے ناولوں میں انسانی وجود کی کشمکش اور نفسیاتی کشمکش کو المیاتی انداز میں بیان کرتے ہیں۔ عبدالصمد کا ناول ''دوگز زمین'' ہجرت اور تقسیم کے موضوع پر لکھے جانے والے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے جس میں اقلیتی طبقہ اپنے وجود کی شناخت کو برقرار رکھنے میں ناکام نظر آتا ہے اور اس کی وفاداری کو شک کی نگاہ سے دیکھ کر اسے مزید تذبذب میں ڈالا جاتا ہے یہاں پروفیسر قمر رئیس کی اس رائے سے بالکل اتفاق کیا جاتا ہے کہ عبدالصمد کا یہ ناول آپنے نہایت ہی سلجھے ہوئے ٹریٹمنٹ اور گہری حقیقت نگاری کی وجہ سے نمایاں رہے گا۔ ناول بہار کے ایک مسلم کنبے کی ہی کہانی پیش نہیں کرتا بلکہ یہ ان لاکھوں مسلمانوں کی کہانی ہے جو اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد بھی اپنی موجودگی اور وفاداری کو ثابت کرتے رہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ نظریاتی تنگ نظری کے سبب نہ تو ان کی موجودگی اور نہ ہی ان کو قبول کیا جا رہا ہے یہی وہ حقیقت ہے جو ناول نگار آزادی کے چالیس سال بعد بھی اختر حسین کے ذریعہ بتانا چاہتے ہیں۔ ''دوگز زمین'' کے علاوہ عبدالصمد نے ''خوابوں کا سویرا''، ''مہاتمہ'' اور ''مہاگر'' جیسے ناول بھی لکھے جن میں تعلیمی نظام، فرقہ واریت اور ساتھ ہی سیکولرازم اور فاشزم جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا ہے۔ ناول ''دھمک'' موجود دور کے سیاسی منظر نامے میں لکھا گیا ہے جہاں ووٹ اور اقتدار کی حرص میں سیاسی لیڈر سیاست کو اتنا نیچے گرا چکے کہ اپنے مفاد کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہوتے ہیں یہاں مذہب کی انتہا پسندی کو بنیاد بنا کر جس طریقے سے جذباتوں کے ساتھ کھلواڑ کیا جا رہا ہے اس کی عمدہ مثال دھمک میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ راجہ رام مہیش اور اعلیٰ بھگوان ایسے کردار ہیں جو موجودہ دور کے سیاسی لیڈروں کے عکس ہیں یہ محض ایک سیاسی موضوع پر لکھا گیا ناول نہیں ہے بلکہ یہ سیاست کا وہ المیہ ہے جو اپنے بدترین دور سے گزر رہی ہے۔ عبدالصمد نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنے ناولوں میں ایک طرف تہذیبی قدروں کی بازیافت کو بنیادی حقیقتیں دیں وہیں دوسری طرف انہوں نے سیاسی جماعتوں کے منفی سیاسی ایجنڈے کو بھی بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے

عبدالصمد کے علاوہ غضنفر کا نام بھی ناول کے میدان میں اہمیت کا حامل ہے انہوں نے ''دویہ بانی''، ''پانی''، ''مانجھی'' جیسے ناول لکھ کر ناول کے میدان میں اہم اضافے کیے ہیں۔ حسین الحق نے اپنے دور کی سیاسی، سماجی، ثقافتی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ ناول میں قدروں کے زوال کے ساتھ ساتھ نئی زندگی کے امکانات بھی نظر آتے ہیں یہاں ناول نگار نے اظہار کے تمام وسائل سے کام لے کر اپنی تخلیقات کو منفرد بنایا ہے خوبصورت استعارات وتشبیہات کے ساتھ ساتھ الفاظوں کا برمحل استعمال نے انہیں اہم ناول نگاروں کی صف میں کھڑا کیا ہے ان کے ناول ''اماوس میں خواب'' پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ انہوں نے اس ناول میں ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کے دونوں رخوں کو بیان کیا ہے اور اس بات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ مذہبی انتہا پسندی، اکثریتی طبقے کی زیادتیاں اور اقلیتی طبقے کی محرومیوں کے باوجود اب بھی مشترکہ تہذیب کی خوبصورت مثالیں موجود ہیں۔ منفی نظریات کے تیزی سے پھیلنے کے باوجود

معاشرہ زیادہ تر مثبت رویے کا حامل ہے۔عصر حاضر کے سیاسی مسائل،طلباء کی سرگرمیاں،یونیورسٹیوں میں سیاست، مندروں اور مسجدوں پر ہو رہی سیاست اور صحافت کی بدلتی ہوئی سوچ کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے صحافت جس طریقے سے خبریں عوام تک پہنچا رہی ہے اور جس طرح سے روز ٹی وی چینل پر بحث مباحثہ ہوتا ہے وہ کسی ایک نظریاتی سوچ کو فروغ دے رہے ہیں۔مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۸۰ کے بعد لکھنے والوں نے ناول کو ایک نئی سمت بخشی جس میں نئی زندگی کے نئے امکانات تھے ساتھ ہی ناولوں میں موضوعات کے ساتھ ساتھ فن اسلوب زبان و بیان ہیئت اور تکنیکی سطح پر بھی تبدیلی نظر آتی ہے گذشتہ دہائیوں سے اردو ادب میں اچھی خاصی تعداد میں ناول اُبھر کر سامنے آئے ہیں یہاں گوپی چند نارنگ کی اس بات سے بالکل اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے اور اکیسویں صدی میں اردو ناول نگار اُبھر کر آئے ہیں ان کے ناولوں کو نظر انداز کر کے آگے بڑھنا مشکل ہے اس ضمن میں غضنفر،مشرف عالم ذوقی،صادقہ نواب سحر وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں یہ ناول نگار ناول کی ارتقاء میں تاریخی حیثیت رکھتے ہیں ان کے علاوہ بھی کئی ناول نگار اپنی تخلیقات کے ذریعے ناول کی آبیاری کر رہے ہیں۔

ناول کا تیسرا باب رحمٰن عباس کی تخلیقات کا تجزیاتی مطالعہ ہے۔اس باب میں رحمٰن عباس کے تمام ناولوں کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔سب سے پہلے ان کے پہلے ناول ''نخلستان کی تلاش'' پر بحث کی گئی ہے۔''نخلستان کی تلاش میں'' یہ رحمٰن عباس کا پہلا ناول ہے جو خزانہ پبلی کیشنز دہلی سے ۲۰۰۴ء میں شائع ہوا۔اس ناول کا انتساب مصنف نے ''کشمیر کی اداس روحوں کے نام'' کیا ہے۔یہ ناول پانچ ابواب پر مشتمل ہے جن میں محبت کے رنگ، وجود اور عدم، یادداشت اور فراموشی، آکار اور نرآکار اور نخلستان کی تلاش شامل ہے۔ناول کا مرکزی کردار جمال ہے جس کے ذریعے مصنف نے ایک طرف نئی نسل کی ذہنی ونفسیاتی کشمکش کو بیان کیا ہے وہیں دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی صورتحال کو بھی بیان کیا گیا ہے۔یہ ایک ایسا ناول ہے جو بمبئی کے ماحول میں تخلیق کیا گیا ہے جس میں زندگی کی نامحرومیاں، مایوسی اور ذہنی گھٹن جمال کے یہاں فرار کو جنم دیتی ہے وہ اپنے وجود کے تئیں تذبذب میں نظر آتا ہے اس کا ہونا یا نہ ہونا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن مصنف کے نزدیک جمال کے وجود کو تذبذب میں دکھانا برصغیر کی نئی سیاسی و معاشرتی تبدیلی کا سبب بھی ہے یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کا جمال اپنی جڑوں سے گہری وابستگی کے باوجود بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔یہ تنہائی ایک ایسی گھٹن کو جنم دیتی ہے جس کے ردعمل میں جمال جیسے لاکھوں کردار یا تو فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں یا اپنے وجود کو ختم کر دیتے ہیں۔مصنف نے ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاسی سوچ کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے جمال کے کردار کے ذریعے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ ''نخلستان کی تلاش میں'' رحمٰن عباس کا پہلا ناول ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ناول فنی نقطہ نظر سے کمزور ہے ابتداء میں زیادہ تر جنسی اور سیاسی موضوعات نظر آتے ہیں اس ناول

میں بھی انہوں نے جمال کے کردار کے ذریعے ان موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ ناول پڑھتے وقت قاری کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ مصنف ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور مذہبی کٹر پن سے ابھرنے والی پیچیدگیوں سے خوف زدہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ فسطائیت کو اپنانے والے حکمرانوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ ان کے نزدیک کس طرح لوگ سیکولرزم کے جال میں پھنستے جا رہے ہیں، وہیں دوسری طرف انہوں نے جمہوریت کے نام سے لوگوں کے ساتھ جو کھلواڑ ہوتا ہے اس پر بھی طنز کسا ہے۔

اس باب کے دوسرے ذیلی حصے میں ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' یہ رحمٰن عباس کا دوسرا اہم ناول ہے جو ۲۰۰۹ء پبلی کیشنز ز دہلی سے شائع ہوا مصنف نے اس ناول کا کا انتساب ''ان محبتوں کے نام جنہیں سماج، مذہب اور اخلاقیات کے خود ساختہ دائرۓ قبول کرنے سے ڈرتے آئے ہیں ان ادیبوں کے نام جو برصغیر کی مجموعی ثقافتی روایت کے دفاع میں سرگرم ہیں''۔ یہ ناول نو ابواب پر مشتمل ہے جن کے عنوانات یوں ہیں میں کیا کہوں میرے دل کا ورق تو سادہ تھا، مگر وہ پھول سا چہرہ نظر نہ آتا تھا، کہ زیر سنگ خنک پانیوں کا چشمہ تھا، میں اپنی گونج تھا اور گنبدوں میں رہتا تھا، ہر ایک طرف سے مجھے آسمان نے گھیرا تھا، سنا نہیں جو کسی نے ہوا کا نوحہ تھا، وہ نیلی جھیل تھی کی آسمان کا ٹکڑا تھا ت، وہاں بھی تیری صدا کا غبار پھیلا تھا اور کہیں کہیں یہ کوئی روشنی کا دھبہ تھا شامل ہے۔ ناول کی سبھی باب شکیب جلالی کی غزل کے مصرعے ہیں۔ یہ ناول کوکن کے تاریخی وسماجی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار عبدالعزیز ہے۔ اس کے علاوہ ناول کے دیگر کرداروں میں میں سکینہ، مجاور حسین اور یوسف شامل ہیں۔ عبدالعزیز کا کردار ناول میں ہر قدم پر اپنی موجودگی کا احساس کراتا ہے۔ سکینہ اور عبدالعزیز کے رشتے کی شروعات ایک اتفاقی جنسی تجربے سے ہوتی ہے جو عبدالعزیز کو زندگی بھر سرور بخشتا ہے اس رشتے کے سبب سکینہ کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوتا ہے جس کا نام یوسف رکھا جاتا ہے جسے مجاور حسین اللہ کا انعام سمجھ کر مدرسے کے حوالے کرتا ہے ناول میں کوکن کی تہذیب اور ثقافت بالخصوص سورل تہذیب کا عبدالعزیز نمائندہ کردار ہے جس کا قتل یوسف کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ یوسف مذہبی انتہا پسندی کا نمونہ ہے جو عبدالعزیز کا قتل دو وجوہات کی بنا پر کرتا ہے پہلی وجہ عبدالعزیز تبلیغی جماعت کے خلاف بولتا ہے اور عملی طور پر بھی اس مذہبی انتہا پسندی کے خلاف اقدامات اٹھاتا ہے دوسری وجہ یوسف اسے سکینہ کے ساتھ چھپ چھپ کر ملتے ہوئے دیکھتا ہے۔ لیکن مصنف کے نزدیک عبدالعزیز کا قتل مذہبی انتہا پسندی کے سبب ہوا یہی وجہ ہے کہ مصنف نے مذہبی انتہا پسندی کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ اس تمام منظر میں یوسف حد درجہ انتہا پسند نظر آتا ہے اور اسی انتہا پسندی کے ردعمل میں عبدالعزیز کو قتل کر دیتا ہے۔

تیسرے ذیلی حصے میں ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ان کا تیسرا اہم ناول ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۱ء میں عرشیہ پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ اس ناول کا انتساب مصنف نے اپنے بچوں ''ماہرہ اور رومی'' کے نام کیا ہے۔ ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' میں بھی مختلف موضوعات نظر آتے ہیں لیکن یہاں مرکزی کردار عبدالسلام کے ذریعے خدا اور اس کے وجود کے بارے میں کھل کر بحث دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ ناول ہے ساتھ ہی اسے نفسیاتی ناول بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔ مصنف نے بڑی باریکی کے ساتھ انسانی نفسیات کی عکاسی کی ہے۔ عبدالسلام کا کردار اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جو اس نظام سے تنگ نظر آتا ہے اور اس تنگی اور گھٹن کے لیے خدا کو ذمہ دار بھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ یہ ناول مذہبی ٹھیکیداروں پر طنز ہے جو اپنی مرضی کے مطابق اسلام کو استعمال کرتے ہیں جس کا مصنف کو ملال ہے۔ ناول کا مرکزی کردار خدا کے متعلق مختلف نظریات کو پیش کرتا ہے، یہاں زندگی کا گہرا فلسفہ بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے لیکن ساتھ ہی گمراہی اور بے راہ روی بھی اس لئے قاری کو چاہیے کی وہ اس ناول کا مطالعہ بڑی گہرائی سے کرے۔ رحمٰن عباس نے انسانوں کے ساتھ خدا کے رشتے کو مشکوک بھری نظروں سے دیکھا ہے یہاں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر خدا صرف مومن کا ہے تو پھر کافروں کے ساتھ اس کا کیا تعلق پورے ناول میں مصنف نے اس طرح کے کئی سوال اٹھائے ہیں جو خدا کے وجود کے متعلق ہیں۔ عبدالسلام کا کردار بھی ایک ایسے انسان کا کردار ہے جو معاشرتی سطح پر انتشار کو دیکھنے کے بعد اس کے نظام کے مالک کو سوال پوچھتا ہے لیکن اسے یقین ہے کہ یہاں ہر چیز کا تعلق خدا سے ہے یہی وجہ ہے کہ وہ خوشی غم یا اس طرح کے احساسات کو اپنی ذات سے منسلک ہونے کے بات کرتا ہے لیکن یہ تمام احساسات وجذبات مستعار ہیں۔ یہاں عورت اور اس کے کردار کو معاشرے کے آئینے میں دیکھنے کی سعی کی گئی ہے جو ازل سے نظر انداز ہوتی رہی ہے لیکن وہیں دوسری طرف کائنات کی رنگ و بو اسی کردار کے سبب ہے یہاں ہندوستانی سماج میں عورت جس طرح سے استحصال کا شکار ہے اس کے لئے مصنف مرد احساس معاشرے کو قصوروار ٹھہراتا ہے۔ ان کے نزدیک عورت کا استحصال جنسی معاشی یا سماجی سطح پر ہر دور میں ہوتا رہا ہے۔ یہ عورتیں زندگی کی تازگی کا سبب ہوتی ہیں اور انسان کو قلبی و ذہنی سکون فراہم کرتی ہیں لیکن پھر بھی ان کا استحصال صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ ناول میں نئی ایجادات کے سبب جس طرح سے تہذیب اور کلچر پر منفی اثرات پڑ رہے ہیں اس کا بھی احاطہ کیا گیا ہے۔ یہاں اس مشینی دور پر بھی گہرا طنز ہے جس نے انسان کو بے بس اور لاچار بنادیا ہے یہاں تک کہ انسان کی ذاتی زندگی میں بھی اس کے منفی اثرات پڑنے لگے ہیں یہی وجہ ہے کہ مصنف اس بات کے سخت خلاف نظر آتے ہیں عبدالسلام کے کردار کے ذریعے مصنف نے استحصال اور عدم مساوات کے خلاف آواز بلند کی ہے یہ استحصال کسی بھی صورت میں کیوں نہ ہو مصنف نے اس کو ناپسند کیا ہے۔

چوتھا ذیلی حصے میں ''روحزن'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ''روحزن'' رحمٰن عباس کا سب سے مشہور ناول ہے۔ یہ ناول ۲۰۱۶ء میں عرشیہ پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوا۔ یہ ناول آٹھ باب میں تقسیم ہے ہر باب کا عنوان بانی کی

ایک غزل کے مصرعے سے شروع ہوتا ہے۔ ''روحزن'' رحمٰن عباس کا سب سے مشہور ناول ہے اس ناول پر مصنف کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ناول میں اسرار اور حنا کے ذریعے ممبئی کے دلکش اور پرفریب زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کا پلاٹ بے حد گھتا ہوا ہے۔ یہ ناول فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ ناول کا آغاز ہی کہانی کے انجام سے ہوتا ہے ۔ یہاں اسرار ایک ایسا کردار ابھر کر سامنے آتا ہے جو گاؤں چھوڑ کر بمبئی کی چکا چوند زندگی کا حصہ بن جاتا ہے لیکن بمبئی کی زندگی اتنی آسان نہیں یہاں آ کر کہانی کا مرکزی کردار تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں طوائف سے لے کر زندگی کے ہر معاملات میں ایک بے بسی اور بے چینی نظر آتی ہے۔اسرار اور حنا کے علاوہ ناول میں یوسف تاجر ایمل شانتی اور مس جمیلہ کے کرداروں کے ذریعے بھی انسان کی ذہنی اور جنسی گھٹن کو پیش کیا گیا ہے۔ ناول میں جہاں دیگر موضوعات کو قلم بند کیا گیا ہے وہیں مذہبی انتہا پسندی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے۔ یہاں مولوی کا بکری کے ساتھ مباشرت کرنا خدا کے وجود کو مشکوک قرار دینا اور شیطان کے ساتھ جو کچھ ہوا اسے ناانصافی قرار دینا جیسے موضوعات بھی نظر آتے ہیں ایمل اور یوسف کے کرداروں کے ذریعے آزاد خیالی کو فروغ دینا ساتھ ہی ایمل کا کھل کر اپنی آزاد خیالی کو سماج میں فروغ دینے کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔اس ناول کا مرکز بمبئی ہیں وہ بمبئی جس کے بطن میں وہ سب کچھ موجود ہے جو انسانی وجود کو سوالات کی چوکھٹ پر کھڑا کر کے تذبذب میں ڈالنے کے لیے کافی ہے اور جن کے جوابات کے لیے ناول کا مرکزی کردار اسرار قدم در قدم متلاشی نظر آتا ہے اور ہر سوال کا جواب اسے جنس کی دہلیز پر پہنچا دیتا ہے جہاں اسے جنسی تسکین تو ملتی ہے لیکن ذہنی اور روحانی تسکین ہرگز نہیں ۔اس کردار نے رشتوں کی اٹوٹ کہانیاں جو اپنے قصبے میں سن رکھی تھیں بمبئی جیسے شہر میں ان کی پرت در پرت کھلنے لگتی ہے اور رشتوں کی پامالی یہ سچ جان کر اسرار نفسیاتی الجھن کا شکار ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ کردار تمام اصول وضوابط کو بھلا کر کبھی مس جمیلہ کو کبھی شانتی کو اور کبھی حنا کو گلے لگاتا ہے۔رحمٰن عباس کے ناول ''زندیق'' میں بھی مذہبی کٹرپن کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے ۔ یہ ناول اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا ناول ہے جس میں محبت، رومان، خواب، جنس، عقیدہ گویا ہر طرح کے واقعات کو پلاٹ میں شامل کر دیا گیا ہے۔ یہ ناول ان کا سب سے ضخیم ناول ہے۔ ۷۸۶ صفحات پر مشتمل یہ ناول مرکزی کردار ثنا اللہ کی توسط سے آگے بڑھتا ہے اور اس میں ایک، ایسے موضوع کو پیش کرتا ہے جسے نہایت سنجیدگی کے ساتھ پڑھنے کی ضرورت ہے۔اس ناول کا بیانیہ بے حد دلچسپ ہے ناول کا آغاز اس یُدھ سے شروع ہو کر موجودہ جرمنی پر ختم ہوتا ہے۔اس ناول میں تمام سرحدوں کو پھلانگ کر دنیا کے معاملات کو بڑے غور وفکر کے بعد پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی ناول میں مذہبی شدت پسندی کے سبب

برصغیر میں جو ماحول پیدا ہوا ہے اس کا اظہار بھی ناول نگار نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے۔ مذہبی انتہا پسندی کے علاوہ اس ناول میں سیاسی اور سماجی انتشار کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

پانچویں ذیلی حصے میں ''زندیق'' کا تجزیاتی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔''زندیق''رحمٰن عباس کا پانچواں ناول ہے جو ۲۰۲۱ء میں شائع ہوا یہ سب سے ضخیم ناول ہے جو ۷۸۶ صفحات پر مشتمل ہے۔''زندیق'' ایک ایسا ناول ہے جس میں غیر ضروری طوالت دیکھنے کوملتی ہے یہ طوالت قاری کو بوجھل بنادیتی ہے ساتھ ہی ناول میں کہانی پن برقرار نہیں رہ جاتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کی ناول میں فاشزم اور مذہبی انتہا پسندی کے سبب عالمی سطح پر جوممالک تباہی کا شکار ہوئے اس کا بھر پور ازالہ کیا گیا ہے لیکن ناول میں واقعات کی بھرمار اور ساتھ ہی ثنااللہ کے ساتھ جتنے قصے جوڑے گئے ہیں ان کا ناول کی بنیادی کہانی سے کوئی تعلق نظر نہیں آتا ہے یہ ناول برصغیر کے ان ممالک کے لیے ایک سبق آموز قصہ ہے جہاں مذہبی انتہا پسندی عروج پا رہی ہے ساتھ ہی جہاں سیاست، مذہب اور وطن پرستی کو ایک ہی نام دیا جارہا ہے۔ناول میں ثنااللہ اس کے منفی اثرات سے واقف کراتا ہے۔ناول میں اور بھی خامیاں نظر آتی ہیں جن میں مذہبی واقعات سے مصنف کا لاعلم نظر آنا ہے دراصل ناول نگار نے اتنا طویل ناول تو لکھ دیا لیکن وہ بہت ساری بنیادی چیزوں کے متعلق تحقیق کرنے سے قاصر نظر آتے ہیں ناول میں رام چندر جی کو برہمن کل سے بتانا مصنف کا مذاہب سے لاعلمی کو ظاہر کرتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ رحمٰن عباس نے''زندیق'' جیسا ناول لکھا لیکن یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ تمام ناولوں میں رحمٰن عباس جنس اور مذہب سے باہر نہیں آپاتے ہیں۔ان کے تمام ناولوں کا محور ومرکز جنس و مذہب ہی ہے۔

مقالے کا چوتھا باب''رحمٰن عباس کی دیگر تخلیقات کا تنقیدی مطالعہ'' کے حوالے سے ہے۔یہ باب چار ذیلی حصوں پر مشتمل ہے پہلا ذیلی حصہ''اکیسویں صدی کی دہلیز پر آہم اردو ناول'' کے حوالے سے ہے تو وہیں دوسرا حصہ''ساجد رشید'' پر مشتمل ہے ساتھ ہی ایک سمت کی تلاش اور اکیسویں صدی میں اردو ناول اور دیگر مضامین' پر گفتگو کی گئی ہے۔پہلے ذیلی حصے میں رحمٰن عباس نے نئی صدی کے ناولوں کو گزشتہ صدی کے ناولوں سے بہتر پایا ہے دراصل رحمٰن عباس کے نزدیک ایک طویل عرصے تک جن ناولوں میں تاریخ پرستی، ماضی پرستی اور مخصوص نظریاتی تہذیبی تاثیر تھی انہیں ہی اچھا ناول قرار دیا گیا لیکن رحمٰن عباس اس بات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ناول میں تاریخ کو موضوع بنایا جاتا ہے اور اسے تاریخی ناول کہہ سکتے ہیں یہ ناول کی کل کائنات نہیں ہے اس طرح انہوں نے ناول کی دوسری اقسام پر بھی بات کی ہے لیکن نئی صدی میں جو چند ناول ابھر کر آئے ہیں ان کو پڑھنے کے بعد رحمٰن عباس اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ ناول اب گزشتہ نصف صدی کی فکشن کی غیر صحت مند تنقید اور ناقدین کی جانبداری کے چنگل سے نکلنے کا واقع پیغام دے

رہا ہے۔اس تصنیف میں رحمان عباس نے جن ناولوں کا ذکر کیا ہے ان میں علی امام نقوی کا ''بساط''۲۰۰۰ جتندر بلو کا ''وشواس گھات'' 2003 عبدالصمد کا ''دھمک''،نورالحسنین کا ''ایوانوں کے خوابیدہ چراغ''۲۰۱۳ مشرف عالم ذوقی کا ''پوکے مان کی دنیا'' اور ثروت خان کا ناول ''اندھیرا پگ'' قابل تعریف ہیں۔اس تنقیدی کتاب کے آخر میں رحمٰن عباس اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ناول کا مستقبل خوش آئند ہے لیکن ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم قرۃ العین حیدر،منشی پریم چند، بیدی، کرشن چندر سے آگے بھی نکل کر نئے لکھنے والوں کی تخلیقات کا بھی جائزہ لیں اور یہ کام نقاد کا بھی ہے جو آنکھ بند کر کے فتویٰ لگا دیتا ہے لیکن نظریاتی اور جانبداری کے فتویٰ کے باوجود فکشن مختلف تبدیلیوں اور اسلوبیات کے مباحث کے زیر اثر روز بروز آگے بڑھ رہا ہے۔

اس باب کا دوسرا ذیلی حصہ ''ساجد رشید'' کی مونوگراف پر مشتمل ہے۔ یہ رحمٰن عباس کا پہلا مونوگراف ہے۔جس میں انہوں نے ساجد رشید کی سوانحی کوائف اور ادبی زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ دراصل ساجد رشید کا نام ان معنوں میں اہمیت کا حامل ہے کہ انہوں نے ادب کی بھرپور خدمات انجام دیں۔ان کا جنم ۱۹۵۵ء میں یوپی کے ایک پسماندہ گاؤں میں ہوا۔ان کی تصانیف میں ناول اور افسانے شامل ہیں۔''رگوں میں جمی برف'' ان کا اہم ناول ہے تو وہیں ''ریت گھڑی'' اور نخلستان میں کھلنے والی کھڑکی'' ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

مقالے کے پانچویں باب میں رحمٰن عباس کے ناولوں میں فکری اور موضوعاتی تنوع کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے۔اس باب کے دو ذیلی حصے ہیں پہلے حصے میں مذہبی موضوعات پر گفتگو کی ہے تو وہیں دوسرے ذیلی حصے میں جنسی موضوعات کو بیان کیا گیا ہے۔ دراصل رحمان عباس کے یہاں مذہب اور جنس دو محبوب موضوع نظر آتے ہیں ان کے پہلے ناول نخلستان کی تلاش میں سے لے کر زندیق تک یہ دونوں موضوعات چھائے ہوئے نظر آتے ہیں۔ان کے نزدیک مذہب کی انتہا پسندی، زوال کا سبب بنتی ہے۔ رحمٰن عباس کی خوبی یہ ہے کہ یہ ہر مذہب کی انتہا پسندی اور کٹرپن کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیوں پر ہندوؤں نے بھی اور مسلمانوں نے بھی خوب اعتراضات کیے ہیں۔جنسی موضوعات کے حوالے سے ان کا ناول زندیق عمدہ مثال ہے۔ رحمٰن عباس کے ناولوں میں جہاں دیگر موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں ان کے ناولوں میں جنسی موضوعات کا بھی اظہار کیا گیا ہے دراصل جنس کا انسانی زندگی کے ساتھ اٹوٹ رشتہ ہے جس کی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا چونکہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ فن کار جنسی جذبات کے اظہار سے منہ نہیں موڑ سکتا ہے لیکن یہاں اس بات کا ذکر کرنا لازمی ہے کہ جنسی موضوعات کا اظہار شہوت پرستی تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ جنس کا صحت مند اظہار فن پارے کی آفاقیت کا ضامن ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب سے لے کر دور حاضر تک فنکاروں نے اس موضوع کو ہر طریقے سے بیان کرنے کی سعی کی ہے یہی وجہ ہے کہ جنس کو آرٹ میں محلول کر دینا فن پارے کا حسن سمجھا جاتا ہے۔ ناول ''روحزن'' رحمٰن عباس کا مشہور ناول ہے جس میں انہوں نے انسان کی ذہنی، جنسی اور نفسیاتی الجھن کو پیش کیا ہے۔ ناول کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح جنسی کجروی زندگیوں کو تباہ و

برباد کردیتی ہے۔لیکن وہیں دوسری طرف مصنف نے جنسی جذبے کو زندگی کا سب سے خوبصورت احساس بھی بتایا ہے۔جو فطری طور پر انسان میں قدرت نے ودیعت کر دیا ہوتا ہے۔لیکن اگر اسے غیر فطری طریقے سے عمل میں لایا جائے تو انسان جنسی گھٹن کا شکار ہوسکتا ہے۔ناول کا مرکز ممبئ ہے اور بمبئ کی زندگی میں جنسی ہی جنس ہے۔مرکزی کردار جس سے بھی

روبرو ہوتا ہے وہ جنسی ہوس کی تکمیل کے لئے کوشش کرتا ہے۔یہاں شانتی کا کردار ایسی ہی جنسی کجروی کا شکار ہوکر طوائف بن جاتی ہے۔دراصل شانتی کو اس کا ماما پونہ لے آتا ہے جہاں وہ اس کا جنسی استحصال کرنے لگتا ہے آخر کار شانتی اس جنسی نا آسودگی اور مجبوری کے سبب طوائف بن جاتی ہے۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ رحمٰن عباس کے ناولوں میں مذہبی کٹر پن، مذہبی انتہا پسندی اور جنسی کجروی جیسے موضوعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ان کے ناولوں میں یہ دونوں موضوعات اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔برصغیر میں مذہب سے پنپنے والے مسائل جس طریقے سے انسان کے لیے خطرہ بن رہے ہیں وہیں دوسری طرف جنسی گھٹن ،جنسی کجروی اور نفسیاتی الجھن انسان کو بے راہ روی کی طرف لے جارہے ہیں۔یہ تمام ناول اپنے اندر موضوعاتی اعتبار سے وسعت رکھتے ہیں۔ان میں مصنف نے جہاں زبان وبیان کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں وہیں کوکن اور ممبئ کی تہذیبی زندگی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس تہذیب میں جہاں مذہب کو اولیت حاصل ہے وہی جنس بھی اس تہذیب میں بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ممبئ کی چکا چوند بھری زندگی کی بات ہو یا پھر کوکن کی گاؤں کی تہذیب، یہاں عشق پروان چڑھتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس عشق میں جنسی جذبے کا دخل بہت زیادہ ہے۔جس کے سبب رشتوں کی پامالی وجود میں آتی ہے۔یہ رشتوں کی پامالی کہیں عبدالعزیز کی جان لیتی ہے تو کہیں شانتی کو طوائف بناتی ہے اور کہیں اسرار اور حنا کو زندگی سے دور لے جاتی ہے۔

مقالے کے آخر میں حاصل مطالعہ پیش کیا گیا ہے جس میں پورے مقالے کے ابواب کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔آخر میں دوران تحقیق زیر مطالعہ کتب اور رسائل وجرائد کی فہرست کتابیات میں دی گئی ہے۔

ABSTRACT

Rahman Abbas ki Takhleeqat-o-Tasneefat ka Tajziati Mutalia

A Thesis

submitted to the University of Jammu

for the award of

Doctorate of Philosophy in Urdu

Submitted BY Supervisor

Partap singh Dr.Farhat Shamim

DEPARTMENT OF URDU

UNIVERSITY OF JAMMU-180006

2023

کے نام'' کیا ہے۔ یہ ناول آٹھ ابواب پر مشتمل ایک نفسیاتی ناول ہے۔ناول کے ابواب کے عنوان اردو کے مشہور شاعر بانی کی ایک غزل کے مصرعہ ہے جس کا اعتراف ناول نگار نے ناول کے صفحہ نمبر ۳۵۵ کی آخری سطر میں کیا ہے۔رحمٰن عباس کے اس ناول کا موضوع عشق ہے جسے نئے انداز سے پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ اس ناول کا ترجمہ جرمن زبان میں بھی ہوا ہے اور جرمنی سے ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا۔

پانچویں ناول ''زندیق'' ۲۰۲۱ء میں عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی سے شائع ہوا۔ یہ ان کا اب تک کا سب سے ضخیم ناول ہے۔۷۸٦ صفحات پر مشتمل یہ ناول برصغیر میں مذہبی انتہا پسندی کے سبب پھیلنے والی دہشت کو بیان کرتا ہے۔ناول کا مرکزی کردار ثنا اللہ ڈار ہے جس کی توسط سے مصنف نے برصغیر کی سیاسی ،سماجی ،مذہبی اور تاریخی صورتحال کا نقشہ کھینچا ہے۔

مذکورہ ناولوں کے علاوہ انھوں نے فکشن تنقید پر بھی کام کیا ہے۔ چونکہ رحمٰن عباس نے اکیسویں صدی میں ناول تحریر کیے اس لئے شاید انہوں نے مناسب سمجھا ہوگا کہ اکیسویں صدی میں لکھے جانے والے فکشن پر کام کیا جائے۔ان کی تنقیدی کتاب ''اکیسویں صدی میں اردو ناول اور دیگر مضامین'' ۲۰۱۴ء میں عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی سے شایع ہوئی۔اس کتاب میں نو تنقیدی مضامین شامل ہیں۔اپنے منفرد اسلوب ،فکر انگیز سوالات اور تنقیدی مباحثات کی وجہ سے اس کتاب کو ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل ہوئی ہے۔اس کے علاوہ ''اکیسویں صدی کی دہلیز

پر آ ہم اردو ناول'' اردو ناول کی تنقید کے حوالے سے ان کی دوسری آ ہم تصنیف ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا لازمی ہے کہ یہ ان کی اپنی تخلیقات نہیں ہیں بلکہ انہوں نے سیمیناروں میں پڑھے گئے مضامین کو یکجا کر کے کتابی صورت میں شائع کیا ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ مضامین ناول کی تنقید کے حوالے سے آ ہم ہیں۔اس کے علاوہ انہوں نے''ایک سمت کی تلاش''اور''ساجد رشید''پر مونوگراف لکھا ہے۔

انعامات واعزازات:۔

رحمٰن عباس نے آج تک ادبی دنیا کے لئے بہت سے کارنامے انجام دیے ہیں۔ان کے کارناموں میں جہد اور جگر کاوی کے ان مٹ نقوش آج بھی ادبی دنیا کے کتبے پر آبِ زر سے کندہ ہیں۔ ان کی اس کوشش اور سخت محنت کے صلہ میں انہوں نے بہت سے انعامات و اعزازات حاصل کیے ہیں، جس سے ان کی ادبی شخصیت کی گہرائی کا اندازہ ہوتا ہے۔علاوہ ازیں رحمٰن عباس کی شخصیت میں سب سے بڑی بات جو ان کی شخصیت کی طرف راغب کرتی ہے وہ یہ ہے کہ جہاں انہوں نے فکشن میں ناموری حاصل کی وہاں انہوں نے ریسرچ آفیسر کے عہدے پر فائز رہ کر وہاں بھی مختلف انعامات و اعزازات حاصل کئے۔اکادمی اور انجمنوں سے حاصل شدہ مختلف ایوارڈز مندرجہ ذیل ہیں:

ا۔ناول''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی''۲۰۰۹ء میں شائع ہوا جس کو یونی ورسل سو سائٹی فار پیس اینڈ ریسرچ (اورنگ آباد) Universal Society for

Peace and research, Aurangabad کی جانب سے ۲۰۱۱ء میں نیشنل ایوارڈ برائے ادب سے نوازا گیا۔

۲۔ناول'' خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' جو ۲۰۱۱ء میں شائع ہوا اور مہاراشٹر اردو ساہتیہ اکادمی کی جانب سے فکشن کی بہترین کتاب کے انعام سے نوازا گیا اور ۲۰۱۵ء میں اسی ناول پر رحمٰن عباس کو عوامی ایوارڈ بھی حاصل ہوا۔لیکن ہندوستانی سماج میں عدم رواداری کی تحریک کے خلاف انہوں نے ایوارڈ مہاراشٹر ساہتیہ اکادمی کو واپس کر دیا۔

۳۔'' روحزن'' ان کا چوتھا ناول ہے ۔ جو ۲۰۱۶ء میں عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی سے شائع ہوا ۔ سب سے پہلے ۲۰۱۷ء میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی کی جانب سے انعام حاصل کیا اور بعد میں اسی ناول پر رحمٰن عباس کو ۲۰۱۸ء میں ہندوستان کے سب سے بڑے ادبی ایواڈ ساہتیہ اکادمی ایواڈ سے نوازا گیا۔

شخصیت:۔

شخصیت کا لفظ بہت وسیع اور گوناں گوں مفہوم کا حامل ہے۔شخصیت انسان کی سیرت اور کردار سے بنتی ہے۔کسی بھی شخصیت کے عناصر ترکیبی میں اس کے ظاہری خد وخال ،سراپا ،اندازو اطوار ،چال ڈھال،مزاج ،عادات ،خیالات،نظریات اور رویے وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔پھر اس شخصیت کو زندگی میں پیش آنے والے کچھ حالات،واقعات بالخصوص بچپن اور جوانی سے متعلق،گھر اور

معاشرے کے ماحول، سماجی، معاشی رویے اور کچھ دیگر شخصیات کے اثرات بھی ان کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔رحمٰن عباس کی شخصیت سازی میں بھی مذکورہ بالا عوامل نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اس طرح ان کی شخصیت کا عکس اور اثرات ان کے فن میں پوری طرح در آئے ہیں۔

رحمٰن عباس کی شخصیت کی ساخت و پرداخت اور ان کی شخصیت کو تشکیل دینے میں جہاں بہت سے خارجی اور داخلی عناصر کارفرما تھے وہیں ان کی زندگی کے ذاتی حالات و تجربات نے بھی ان کی شخصیت کے ارتقا میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔رحمٰن عباس ایک اچھے ناول نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھے فکشن نقاد بھی ہیں۔ایک اہم شخصیت ہونے کے باوجود ان کی شخصیت میں تکبّر، تصنع اور بناوٹ کے بجائے سادگی ہے جو ان کے پہناوے، بات چیت اور انداز و اطوار سے صاف جھلکتی ہے۔یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شخصیت کی ظاہری جھلک شخصیت کے بارے میں ایک اہم اور فیصلہ کن تاثر قائم کرنے میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔شخصیت اور فن کے حوالے سے رحمٰن عباس کی تحریریں ہم جیسے جیسے پڑھتے جاتے ہیں ان کی شخصیت کے رنگا رنگ پہلو ہمارے سامنے آتے جاتے ہیں اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ایک شخص کو اہم شخصیت بنانے میں یا ایک خاص سانچے میں ڈھالنے میں سب سے پہلے والدین کی تربیت کا اہم کردار ہوتا ہے۔

انسانی ذہن، نفسیات، مزاج، عادات اور رویوں کو ایک خاص سانچے میں

ڈھالنے میں جہاں داخلی و خارجی حالات و واقعات کا گہرا اثر ہوتا ہے، وہیں اس سے اپنی زندگی میں چند ایسی شخصیات سے ضرور واسطہ پڑتا ہے جو نہ صرف ان کے خیالات اور کردار پر گہرا اثر چھوڑتی ہے بلکہ ان شخصیات کے اثرات اس کی اپنی شخصیت کا حصہ بن جاتے ہیں۔رحمٰن عباس کی شخصیت کی اس انفرادی نہج کی نشو ونما میں بھی بہت سی شخصیات نے اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔اس ضمن میں عنبر بلال کچھ اس طرح لکھتے ہیں:

> ''رحمٰن عباس اسکول ، کالج کے دور میں مختلف ادبی و علمی سرگرمیوں جیسے بیت بازی ،تقریری مقابلوں ، بحث و مباحثہ اور مضمون نویسی میں حصہ لیا کرتے تھے۔زمانہ طالب علمی میں ان کے اساتذہ میں افسانہ نگار مظہر سلیم، ڈرامہ نویس اقبال نیازی ، شاعر یعقوب راہی اور کالج کے مشہور شاعر رفیعہ شبنم عابدی ، الیاس شوقی ، خاکہ نویس انور ظہیر اور معروف ادیبہ میمونہ دلوی شامل رہے ہیں۔'' [۶]

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ رحمٰن عباس کی شخصیت کو پروان چڑھانے میں ان کے استاتذہ کا خاصہ رول رہا ہے۔ رحمٰن عباس پرفیسر گوپی چند نارنگ کی شخصیت سے بہت زیادہ متاثر ہیں۔ رحمٰن عباس کو ان میں انسانیت کا وہ نمونہ نظر آتا ہے جو قابل تقلید ہے۔وہ ان کی بے پناہ عزت کرتے ہیں۔اس بات کا اندازہ ان کے ناول کے انتساب سے ہوتا ہے جو انھوں نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نام

کیا ہے۔ناول ''روحزن'' کا انتساب اس طرح کیا ہے۔

'' ہندوسانی مشترکہ تہذیب کی روشن علامت پروفیسر گوپی

چندنارنگ کے نام'' ؎

رحمٰن عباس کو زمانہ طالب علمی سے ہی پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔رحمٰن عباس زیادہ تر انگریزی ادب کا مطالعہ کرتے تھے۔جس کے باعث ان کے خیالا ت و افکار میں کافی وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہوا۔ انگریزی ادب کے مطالعے کے باعث ان کے اسلوب میں جدت طرازی کا حسن پیدا ہوا ۔رحمٰن عباس ایک جامع شخصیت کی مالک ہیں۔

رحمٰن عباس کا ماننا ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی کوئی بھی نعمت خراب نہیں ہوتی رحمٰن عباس زیادہ تر کوکنی اورمراٹھی کھانے کے ساتھ ساتھ مچھلی کھانا پسند کرتے ہیں ۔رحمٰن عباس ایک سینئرفکشن رائٹر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ دارانسان بھی ہیں ان کے معمولات زندگی میں لکھنا پڑھنا ،آفس کا کام کرنا، بچوں کے ساتھ وقت گزارنا ، دوستوں کے ساتھ ملنا جلنا،کوکن میں گھومنا اور ریسرچ میں وقت صرف کرنا وغیرہ شامل ہیں۔لکھنا پڑھنا ان کا پسندیدہ مشغلہ ہے،اس کے لیے انھوں نے کوئی مخصوص وقت مختص نہیں کیا ہے۔رحمٰن عباس کے مطابق ۔

'' لکھنے پڑھنے کے لیے مجھے خاص وقت کی ضرورت نہیں

ہوتی ۔جب بھی میرا مزاج لکھنے پڑھنے کے لیے بن جاتا ہے تو میں

بلا کسی تامل کے قلم کاپی اٹھاتا ہوں اور لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔'' ۸؎

رحمٰن عباس کا کہنا ہے کہ میرا شوق ہے ادبی محفلوں میں جانا، ادبی گفتگو سننا، ادیبوں سے بحث و مباحثہ کرنا، ادبی انٹرویوز کرنا، سیر وتفریح کے لیے جانا، اچھے لوگوں میں بیٹھنا، لکھنا اور کتابیں پڑھنا، میری روزمرہ کی زندگی میں شامل ہے۔

رحمٰن عباس باشعور، حساس، ذہین اور ذہنی پختگی کی حامل شخصیت کے طور پر مشہور ہیں۔ رحمٰن عباس کی شخصیت کا سب سے لائق تحسین اور غالب پہلو یہ ہے کہ ان کے ظاہر اور باطن میں کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔ ایک انسان، استاد، شاگرد، دوست اور ایک ناول نگار کی حیثیت سے وہ ہمیشہ قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ بطور انسان وہ بڑے روادار اور محبت کرنے والی شخصیت ہیں۔ دوسروں کی باتوں پر کھل کر رائے دیتے ہیں۔ رحمٰن عباس کا معاصرین کے ساتھ بھی دوستانہ رویہ رہتا ہے۔ انہوں نے ذاتی بغض، حسد اور جلن سے خود کو ہمیشہ دور رکھا ہے۔ وہ ہر کسی سے بڑی فراخ دلی سے ملتے ہیں۔ کسی صلہ اور ستائش کی پروا نہیں کرتے اور معاصرانہ چشمک سے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔

رحمٰن عباس جہاں ایک اچھے ادیب اور فکشن نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں وہیں وہ ایک اچھے دوست بھی ہیں۔ انھوں نے جس سے بھی دوستی کی پوری طرح نبھائی۔ وہ جو انھیں پسند آتا اس سے خلوص پوری ایمانداری سے نبھاتے اور جو انھیں پسند نہ آتا اسے منہ پر کہہ دیتے ہیں۔ دکھاوا ان کی شخصیت میں بالکل نہیں ہے۔ ان

کے ایک دوست زمرد مغل ایک انٹرویو میں یوں فرماتے ہیں۔

''رحمٰن عباس نہ صرف ایک اچھے تخلیق کار ہیں بلکہ ایک اچھے
دوست اور ایک بہتر انسان بھی ہیں یہ بات وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں
جن کا کسی طرح کا تعلق ان سے رہا ہے یہ ضروری نہیں کہ ایک اچھا
تخلیق کار بہتر انسان بھی ہو لیکن رحمٰن عباس جتنے اچھے فکشن نگار ہیں
اتنے ہی اچھے انسان بھی ہیں۔۔''[۱۰]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ رحمٰن عباس جب کسی سے دوستی کا ہاتھ بڑھاتے ہیں پورے خلوص کے ساتھ اس دوستی کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔دکھاوے کے لحاظ سے دوستی نہیں کرتے۔دوستی میں کسی طرح کے مفاد کو ملحوظ نہیں رکھتے ہیں بلکہ سچی اور بے غرض دوستی کرتے ہیں۔بحیثیت دوست محبت کرنے والے مخلص ،ملنسار اور دوست نواز ہیں۔

حوالہ جات

۱۔ شخصی انٹرویو رحمٰن عباس بہ ذریعہ سوال نامہ (ای۔میل)، انٹرویور پرتاپ سنگھ ۱۶ جولائی ۲۰۱۹ء

۲۔ تحقیقی مقالہ رحمٰن عباس کی ناول نگاری از عنبر بلال ص، ۱۰

۳۔ شخصی انٹرویو رحمٰن عباس بہ ذریعہ سوال نامہ (ای۔میل)، انٹرویور پرتاپ سنگھ ۱۶ جولائی ۲۰۱۹ء

۴۔ ایضاً

۵۔ ایضاً

۶۔ تحقیقی مقالہ رحمٰن عباس کی ناول نگاری از عنبر بلال ص، ۱۰

۷۔ ناول ''روحزن'' از رحمٰن عباس ص، ۳۰۔

۸۔ شخصی انٹرویو بہ رحمٰن عباس ذریعہ سوال نامہ (ای۔میل)، انٹرویور پرتاپ سنگھ، ۱۶/ جولائی ۲۰۱۹ء

۹۔ شخصی انٹرویو (زمرد مغل) بہ ذریعہ سوال نامہ (ای۔میل)، انٹرویور پرتاپ سنگھ ۲۰/ جولائی ۲۰۱۹ء

۱۰۔ ایضاً

باب دوم

۱۹۸۰ء کے بعد اُردو ناول ایک جائزہ

فکشن کے تین پڑاو ہیں داستان ،ناول اور افسانہ ۔اول میں ایک طرف زندگی کی حقیقتوں کا بیان ہوتا ہے وہیں دوسری طرف اس کا کینوس بہت وسیع ہوتا ہے۔ ناول انسانی زندگی اور سماج کے حالات اور واقعات کی ترجمانی کرتا ہے۔ زندگی اور سماج جس طرح کروٹ بدلتا ہے ناول اس بدلاؤ کی عکاسی کرتا ہے اتنا ہی نہیں ناول میں سیاسی ،تاریخی، اقتصادی اور سماجی تغیرات کو بھی پیش کرنے کی بھرپور گنجائش ہوتی ہے۔ انگریزی لفظ ''ناول'' کے معنی نئے کے ہیں دراصل اس کا نام ناول اس لیے پڑا کہ اس کا انداز پرانی داستانوں کے مقابلے میں نیا تھا۔ ناول نثری صنف ہے جس میں زندگی کی ترجمانی ہوتی ہے دراصل ناول اصل میں زندگی کی تصویرکشی کا فن ہے ناول نگار جن حقیقتوں کا اظہار کرتا ہے وہ ہمارے سماج اور زندگی سے تعلق رکھتی ہے ناول پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر انور پاشا اپنی کتاب کے پیش لفظ میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''ناول کو عہد جدید کا رزمیہ کہا گیا ہے کیونکہ عہد جدید کی انسانی زندگی میں پیچ وخم شکست وریخت تخریب وتعمیر صفات ذات و تصادم اور آویزش آمیزش سے دوچار ہے اس کا اظہار کا وسیلہ بننے کی صلاحیت جتنی ناول میں ہے اتنی کسی دوسری اصناف میں نہیں کسی بھی معاشرے ملک یا قوم کی تہذیبی ومعاشرتی زندگی کی تصویرکشی جس حد تک ناول کے ذریعے ممکن ہے شاید ہی کسی دوسری صنف کے ذریعہ

ہو۔ ناول معاشرے میں فرد اور ذات کے نہ صرف خارجی عوامل
وعناصر کو پیش کرتا ہے بلکہ داخلی تصادم اور اس کے محرکات کو بھی اپنی
گرفت میں لے لیتا ہے اس طرح یہ کسی قوم ملک یا معاشرے کی
فکری اور نظریاتی فضا کا اظہار بھی ہوتا ہے۔''[1]

نذیر احمد نے اصلاحی ناول لکھے انہوں نے متوسط مسلم معاشرے میں خواتین کی زندگی کو موضوع بنایا ان کے ناولوں میں لڑکیوں کی تعلیم اور معاشرے میں ان کی پوزیشن کو ظاہر کرنے کی سعی کی گئی اس کے بعد عبدالحلیم شرر، رتن ناتھ سرشار، مرزا ہادی رسوا، پریم چند، کرشن چندر، عصمت چغتائی، انتظار حسین، قرۃ العین حیدر، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ جیسے ناول نگار سامنے آئے جنہوں نے انیسویں اور بیسویں صدی کے سیاسی، سماجی، معاشی اور سیاسی منظر نامے کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔

موضوعاتی، ہیئتی اور تکنیکی سطح پر ناول کے فن میں بھرپور پختگی آ چکی تھی اس دور میں قرۃ العین حیدر، خواجہ احمد عباس، انتظار حسین اور حیات اللہ انصاری جیسے ناول نگار اس فن میں یکتا نظر آرہے تھے تقسیم کے بعد کے ناولوں میں انسانی قدریں وتہذیبی زوال اور زندگی کے نئے اُبھرتے ہوئے مسائل کا اظہار ہونے لگا ان ناولوں میں فسادات سے ابھرنے والی نئی زندگی کے سامنے جو مسائل تھے ان کا بھی احاطہ نظر آتا ہے اس دور کے ناولوں پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر اسلم آزاد اپنی کتاب میں یوں رقمطراز ہیں:

''ملک کی تقسیم کے کچھ ہی دنوں بعد ایک نئی بات جو ہمارے
سامنے آئی وہ یہ تھی کہ دونوں ملکوں کے لکھنے والوں نے ایسے
موضوعات کی تلاش کر لی جو ان کے جینز کو راس آتے تھے پھر بھی
حیرت کی بات ہے کہ تقسیم کے بعد سے آج تک ہر دو ملک میں
جو قدر اولی کے ناول لکھے گئے ان میں بیشتر ایسے تھے جن میں ہمہ گیر
سچائی تھی اور اعلیٰ انسانی قدروں کی بازیافت کا صلہ تھا ایسے سبھی ناول
دونوں ملکوں میں احترام اور عقیدت کے ساتھ پڑھے گئے''۔[۲]

۱۹۸۰ء کے بعد لکھنے والوں کی جو پود اُبھر کر سامنے آئے انہوں نے اردو ناول کو ہر لحاظ سے وسعت بخشی دراصل یہاں سے ہمارا معاشرہ اکیسویں صدی میں ڈھلتا ہے جہاں زندگی کے لیے بیسویں صدی کی برعکس چیلنج نظر آتے ہیں۔ سیاسی تصادم ،اقلیتی طبقے کے مسائل اور جدید تجربات معاشرے کے وہ موضوعات ہیں جن سے ناول الگ نہیں رہ سکتا تھا یہی وجہ ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد اکیسویں صدی کی تیسری دہائی تک جو ناول ہمارے سامنے آ رہے ہیں ان میں سماجی شعور کے ساتھ انسانی وجود کے خطرات جیسے موضوعات بھی نظر آتے ہیں یہاں عالمی سطح پر سیاسی ،سماجی، اور معاشی سطح پر جو تصادم ابھر کر سامنے آیا ہے اس نے ہر اعتبار سے مذہبی اثرات قبول کیے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس وقت تمام دنیا میں مذہبی انتہا پسندی بحث کا موضوع بنا ہوا ہے جس نے نسل آدم کے وجود میں کئی منفی خیالات کو جنم دینا شروع

کیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہر ملک کا اقلیتی طبقہ خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگا ہے۔ ۱۹۸۰ء کے بعد جو اہم ناول نگار سامنے آئے ان میں عبدالصمد ،غضنفر، حسین الحق ،شموئل احمد،مشرف عالم ذوقی ،زاہدہ زیدی ،ترنم ریاض ،ثروت خان ،شمس الرحمٰن فاروقی ،کشمیری لال ذاکر، صادقہ نواب سحر اور رحمان عباس کے نام اہمیت کے حامل ہیں انہوں نے اپنے ناولوں میں معاشرے کے بدلتے ہوئے شعور کو موضوع بنایا ہے۔ عبدالصمد کا ناول ''دو گز زمین'' ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے سیاسی تناظر میں لکھا گیا ہے دراصل ناول میں تقسیم ہند کے ساتھ ساتھ تقسیم بنگلہ دیش کو بھی موضوع بنایا گیا ہے ناول میں سیاسی جماعتوں کی آپسی کشمکش کے سبب عوامی سطح پر جو اتھل پتھل منظر عام پر آئی ہے اس کے سبب فرقہ وارانہ فسادات ابھرتے ہیں اس طرح قیام پاکستان اور پھر بنگلہ دیش کا وجود میں آنا انسانیت کے لیے دل سوز ثابت ہوتا ہے۔ مہاجرین کو جن مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے اس کی مثالیں اس ناول میں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ ناول کی کہانی خلافت کے زمانے سے شروع ہو کر بنگلہ دیش کے قیام کے بعد تک کے سیاسی منظرنامے کو پیش کرتی ہے۔ کہانی بہار کے ایک شریف گھرانے سے شروع ہوتی ہے جہاں شیخ الطاف حسین ایک اہم کردار کی صورت میں سامنے آتے ہیں ان کی سیاسی سوجھ بوجھ کے اثرات ان کے بچوں پر بھی پڑے یہی وجہ ہے کہ اس کے انتقال کے بعد اس کے بیٹے سرور حسین، اصغر حسین اور داماد اختر حسین سیاست کے میدان میں میں فعال نظر آتے ہیں لیکن جیسے

جیسے وقت گزرتا ہے تو ایک ہی گھر کے رہنے والے افراد میں سیاسی سطح پر اختلافات نظر آنے لگتے ہیں ایک طرف اصغر حسین مسلم لیگ میں شامل ہوتے ہیں تو دوسری طرف اختر حسین کانگریس میں شامل ہو جاتے ہیں یہیں سے کہانی دو مختلف خیالات کو لے کر آگے بڑھتی ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان نظریاتی اختلافات نے تقسیم کے بعد دونوں کی زندگیوں کو کافی متاثر کیا۔ گھر میں دو متضاد نظریوں کے سبب آئے دن کبھی مسلم لیگی آ جاتے تو کبھی کانگریس کارکن اور گھر کی عورتیں ان کی خدمت گزاری میں کوئی کمی آنے نہیں دیتی:

> ''گھر کی عورتیں ایک طرف مسلم لیگی کارکنوں کے لیے دیگیں چڑھاتی تو دوسری طرف کانگریس کارکنوں کے لئے پرہیزی غذائیں تیار کراتیں۔''[۳]

تقسیم ہند کے بعد ناول میں ایک اہم موڑ آتا ہے اصغر حسین ہجرت کر کے پاکستان چلا جاتا ہے اختر حسین ہندوستان میں ہی رہنے کو ترجیح دیتے ہیں لیکن ان کا بیٹا حامد نوکری کی غرض سے پاکستان چلا جاتا ہے جہاں سے وہ اپنے گھر والوں کو خط لکھتا ہے خط و کتابت کے اس سلسلے نے اختر حسین اور اس کے کنبے کو شک کے دائرے میں کھڑا کر دیا اور ان پر پاکستان کو خفیہ خبریں پہنچانے کا الزام لگتا ہے جس کے سبب اس کے گھر پر سی بی آئی تلاشی لینے آتی ہے اس طرح برسوں کی وفاداری کا صلہ اختر حسین کو نہایت ہی المیائی انداز میں ملتا ہے:

''پاکستان کا قیام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے جو ہر
قیمت پر ہندوستان میں ہی رہنا چاہتے تھے ذلت کا پروانہ ثابت ہوگا
یہ بات ہر وہ آدمی سمجھ رہا تھا جو تمہارے نانا کے ساتھ کام کیے ہوئے
تھا تمہاری نانی اماں بھی اس بات کو اچھی طرح سمجھتی تھیں۔''[۴]

ناول میں تہذیبوں کے درمیان ٹکراؤ کے سبب جو ہجرت کا المیہ سامنے آتا ہے وہ انسانی زندگی کا سب سے بڑا المیہ تھا مہاجرین کی زندگیاں بد سے بدتر ہوگئی تھیں ہندوستان سے ہجرت کرکے لوگ پاکستان چلے گئے اور پاکستان سے بنگلہ دیش، اس ہجرت کے بعد ہجرت نے انسانی قلب کو کبھی بھی سکون نہیں بخشا۔ یہ ناول ہجرت اور تقسیم کے موضوع پر لکھے جانے والے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے جس میں اقلیتی طبقہ اپنے وجود کی شناخت کو برقرار رکھنے میں ناکام نظر آتا ہے اور اس کی وفاداری کو شک کی نگاہ سے دیکھ کر اسے مزید تذبذب میں ڈالا جاتا ہے یہاں پروفیسر قمر رئیس کی اس رائے سے بالکل اتفاق کیا جاتا ہے کہ عبدالصمد کا یہ ناول آپنے نہایت ہی سلجھے ہوئے ٹریٹمنٹ اور گہری حقیقت نگاری کی وجہ سے نمایاں رہے گا۔ناول بہار کے ایک مسلم کنبے کی ہی کہانی پیش نہیں کرتا بلکہ یہ ان لاکھوں مسلمانوں کی کہانی ہے جو اپنا سب کچھ گنوا دینے کے بعد بھی اپنی موجودگی اور وفاداری کو ثابت کرتے رہے لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ نظریاتی تنگ نظری کے سبب نہ تو ان کی موجودگی اور نہ ہی ان کو قبول کیا جا رہا ہے یہی وہ حقیقت ہے جو

ناول نگار آزادی کے چالیس سال بعد بھی اختر حسین کے ذریعہ بتانا چاہتے ہیں۔'' دو گز زمین'' کے علاوہ عبدالصمد نے'' خوابوں کا سویرا''،'' مہاتما'' اور'' مہا گر'' جیسے ناول بھی لکھے جن میں تعلیمی نظام، فرقہ واریت اور ساتھ ہی سیکولرازم اور فاشزم جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ناول'' دھمک'' موجود دور کے سیاسی منظر نامے کو پیش کرتا ہے جہاں ووٹ اور اقتدار کی حرص میں سیاسی لیڈر سیاست کو اتنا نیچے گرا چکے کہ اپنے مفاد کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہوتے ہیں یہاں مذہب کی انتہا پسندی کو بنیاد بنا کر جس طریقے سے جذبات کے ساتھ کھلواڑ کیا جا رہا ہے اس کی عمدہ مثال دھمک میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

راجہ رام مہیش اور اعلیٰ بھگوان ایسے کردار ہیں جو موجودہ دور کے سیاسی لیڈروں کے عکس ہیں یہ محض ایک سیاسی موضوع پر لکھا گیا ناول نہیں ہے بلکہ یہ سیاست کا وہ المیہ ہے جو اپنے بدترین دور سے گزر رہی ہے۔عبدالصمد نے نہایت خوبصورتی کے ساتھ اپنے ناولوں میں ایک طرف تہذیبی قدروں کی بازیافت کو بنیادی حقیقتیں دیں وہیں دوسری طرف انہوں نے سیاسی جماعتوں کے منفی سیاسی ایجنڈے کو بھی بے نقاب کرنے کی سعی کی ہے۔

عبدالصمد کے علاوہ غضنفر کا نام بھی ناول کے میدان میں اہمیت کا حامل ہے انہوں نے'' دویہ بانی''،'' پانی''،'' مانجھی'' جیسے ناول لکھ کر ناول کے میدان میں اہم اضافے کیے ہیں۔'' دویہ بانی'' کا موضوع ہندو مائیتھولوجی ہے دراصل دویہ بانی

دیوتاؤں کی بانی کو کہا جاتا ہے اور قدیم زمانے میں ہندوستان میں ذات پات کا بھید بھاؤ کافی تھا یہی وجہ ہے کہ نچلی ذات یعنی شودر وغیرہ کے ساتھ چھوت چھات کی جاتی تھی انہیں مذہبی کاموں سے دور رکھا جاتا ہے اور اونچی ذات کے لوگ ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا اپنی توہین سمجھتے تھے ان موضوعات کو عصر حاضر کے پس منظر میں پیش کیا گیا ہے۔'' دویہ بانی'' میں استحصال اور احتجاج کی کہانی ہے کہانی کا مرکزی کردار بالیشور برہمن ہونے کے باوجود اس مذہبی تقدس کی پامالی کے خلاف اٹھ جاتا ہے اور اس مذہبی رویہ کیخلاف احتجاج بلند کرتا ہے لیکن یہاں جو چیز قاری کو کھٹکتی ہے کہ بالیشور کی جگہ نچلی ذات کا کوئی شخص اگر اس مذہبی اور غیر انسانی رویہ کے خلاف بغاوت کرتا تو ناول زیادہ کامیاب ہوتا لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کسی ایک ایسے معاشرے میں جہاں ذات پات کا بول بالا ہو انسان کی تقسیم ذات اور دولت کے سبب کی جاتی ہو دیوتاؤں یا دوسرے مذہبی باتوں کو سننے پر کانوں میں شیشہ پگھلا کر ڈالا جاتا ہو وہاں کسی نے اپنی ذات کے انسان کا اس نظام کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا بھی غیر فطری معلوم ہوتا ہے اور اگر ناول نگار بالیشور کو برہمن کے بجائے دلت کے کردار میں پیش کرتا تو یہ بھی سچ ہے کہ یہ کردار مثالی کم اور کٹ پتلی زیادہ نظر آتا بے شک ایک برہمن کا برہمن کے بنائے ہوئے نظام کے خلاف آواز بلند کرنا کسی حد تک غیر فطری معلوم ہوتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ بالیشور جیسے کردار تاریخ میں ضرور نظر آتے ہیں جنہوں نے اپنوں کے بنائے ہوئے نظام کے خلاف آواز بلند کی یہ ناول دلتوں

کے مسائل ان کی زندگی کے دکھ درد اور سماجی سطح پر ان کی پوزیشن کو ظاہر کرتا ہے اس ناول کی ابتدا اس دلسوز انداز سے ہوتی ہے:

''ہون کنڈ کے چبوترے کے نیچے پتھریلی زمین پر جھگرو کی بلی چڑھنے والے جانور کی مانند پچھاڑیں کھا رہا تھا آنکھوں کے ڈلے باہر نکل آئے تھے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا تھا رگڑ سے جسم کی جلد جگہ جگہ سے چھل گئی تھی اور اس سے خون رس رہا تھا اس کے کربناک چیخ دور دور تک گونج رہی تھی چیخ سن کر بالک کی سماعت لرزنے لگی معصوم دل و دماغ کا ریشہ ریشہ کپکپا اٹھا خوش منظری کی عادی پرسکون آنکھیں ہول ناک منظر دیکھ کر مضطرب ہو گئیں۔مگر بابا کے چہرے پر اثرات کے بجائے اطمینان تھا ان کی آنکھوں میں چمک دمک بھی تھی بابا کے چہرے کا سکون اور آنکھوں کی چمک دیکھ کر بالک کی نگاہیں حیران ہو اٹھی بابا اسے پیڑت کیوں کیا گیا؟ اس سے پریشان ہو کر سوال کیا۔''

بیٹیا سے ڈنڈ دیا گیا ہے بابا نے بڑے ہی شانت اور سپاٹ لہجے میں جواب دیا۔'' ۵؎

یہ ڈنڈ دراصل دو یہ بانی کو سننے کا تھا جسے جھگرو نے غلطی سے سنا تھا امن کے بنائے ہوئے ان اصولوں کو توڑنے پر اسے ایسی سزا دی گئی کی بالشیور کا دل اور دماغ

مجروح ہو گیا۔ یہیں سے اس مذہبی رویہ کے خلاف ایک احتجاجی آواز بلند ہونے لگتی ہے جو دلت کے گھرانے سے نہیں بلکہ خود برہمن کے گھر سے شروع ہوتی ہے یہ ناول آج کے مسائل کے پس منظر میں لکھا گیا ہے جہاں آج بھی کئی مقامات پر دلتوں اور پچھڑوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک کیا جاتا ہے۔ آئینی تحفظ کے باوجود ذات پات اور مذہبی انتہا پسندی کے دائرے سے اب تک انسان نہیں نکل پایا ہے آج بھی کہیں نہ کہیں جھگر وہمیں مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے کہیں یہ دلت شودر کی ذات کی صورت میں نظر آتا ہے تو کہیں اقلیتی طبقہ میں جہاں اسے مذہبی انتہا پسندی کا شکار بنایا جاتا ہے۔

''دو یا بانی'' کے علاوہ بھی غضنفر نے اہم ناول لکھے جن میں سیاسی، سماجی، جنسی اور تاریخی موضوعات نظر آتے ہیں۔ حسین الحق کو اردو ناول کے میدان میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے انہوں نے ''بولومت چپ رہو''، ''فرات'' اور ''اماوس میں خواب'' جیسے اہم ناول لکھے ہیں۔ ان کا پہلا ناول ''بولومت چپ رہو'' کے نام سے میں شائع ہو۔ اس ناول کا بنیادی موضوع ایک طرف محکمہ تعلیم کی افسر شاہی اور دوسری طرف نکسل تحریک کو موضوع بنایا گیا ہے ناول دراصل تعلیمی اداروں میں ہونے والی نا انصافیوں فسادات اور افسر شاہی کے سبب پیش آنے والے نئے مسائل کی ترجمانی کرتا ہے ناول میں ماسٹر صاحب کا کردار مرکزی حیثیت کا حامل ہے جو اپنی ایمانداری اور فرض شناسی کے سبب مشہور ہے لیکن بدلتے ہوئے تعلیمی

نظام اور ماحول میں ماسٹر صاحب فرض شناسی اور ایمانداری کے معنی بدلتے ہوئے دیکھتے ہیں ان کا دوسرا ناول ''قرات'' ۱۹۹۲ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول بیک وقت تین نسلوں کے تصادم کا اظہار ہے۔ پہلی نسل وقار احمد کے والد کی دوسری خود وقار کی اور تیسری ان کے صاحبزادے فیصل تبریزی اور بیٹی شبل کی ہے۔ یہ ناول نئی اور پرانی زندگی کی داستان ہے جہاں ایک طرف وقار احمد بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ خود کو بدل نہیں پاتے اور اس کے سبب ذہنی الجھن کا شکار ہو کر ہر وقت اپنے ماضی کو گلے لگائے نظر آتا ہے لیکن وہیں دوسری طرف اس کے بیٹے اور بیٹی شبل ماڈرن زندگی کا حصہ بن چکے ہیں اس نئی زندگی میں جو دو اہم باتیں نظر آتی ہیں وہ لباس اور اخلاقی قدروں کا زوال ہے۔ وقار احمد اپنے تہذیبی اثاثے کو سینے سے لگائے ہوئے رکھتا تو ہے لیکن اس کے بچے نئے ماحول کی پیداوار ہیں جہاں چھوٹے کپڑے اور اور بوائے فرینڈ گرل فرینڈ کا عام رواج ہے:

''میرا بوائے فرینڈ ہے پاپا۔۔شام نے بڑی ہی سرسری انداز میں جواب دیا اور ممی کی طرف مخاطب ہو گی ممی وہ کہتا ہے کہھلکی کلر میں تم ایک دم اینجل لگتی ہو۔شمن میں کے گلے میں باہیں یہی حال کرتے ہوئے کہا اچھا بابا یہ لو۔ممی نے ملکی کلر کا ایک سیلولیس نکال کر دیتے ہوئے کہا اور جب وہ چلی گئی تو ممی فیصل کی طرف مڑی۔۔۔کبھی کبھی آپ کو کیا ہو جاتا ہے؟ بچوں کے ساتھ اتنی سختی

سے پیش آنے لگتے ہیں۔''٦؎

یہی وہ اخلاقی قدروں کا زوال ہے جو ناول کے مرکزی کردار کو نئے ماحول میں ایڈجسٹ ہونے نہیں دیتا ہے۔ناول میں بڑی بیبا کی کے ساتھ نسلوں کے تصادم کو دکھایا گیا ہے قدروں کے اس زوال کو دیکھتے ہوئے وقار بے حد بے چین نظر آتا ہے۔زبان کے اعتبار سے یہ ناول قابل اعتبا ہے۔ناول میں مصنف نے کرداروں کو محنت سے تراشا ہے یہ کردار اپنے ظاہر اور باطن کے ساتھ کھل کر ہمارے سامنے آتے ہیں یہ کردار ہمارے معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جو بھی واقعات ان کرداروں کے ذریعے منظر پر آتے ہیں قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کی ان کرداروں سے روز اس کا واسطہ پڑتا ہے۔حسین الحق نے اپنے دور کی سیاسی، سماجی ،ثقافتی زندگی کو موضوع بنایا ہے۔ ناول میں قدروں کے زوال کے ساتھ ساتھ نئی زندگی کے امکانات بھی نظر آتے ہیں یہاں ناول نگار نے اظہار کے تمام وسائل سے کام لے کر اپنی تخلیقات کو منفرد بنایا ہے خوبصورت استعارات و تشبیہات کے ساتھ ساتھ الفاظ کا برمحل استعمال نے انہیں اہم ناول نگاروں کی صف میں کھڑا کیا ہے ان کے ناول ''اماوس میں خواب'' پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔انہوں نے اس ناول میں ہندوستان کی سیاسی اور سماجی زندگی کے دونوں رخوں کو بیان کیا ہے اور اس بات کی طرف توجہ دلانے کی کوشش کی ہے کہ مذہبی انتہا پسندی، اکثریتی طبقے کی زیادتیاں اور اقلیتی طبقے کی محرومیوں کے باوجود اب بھی

مشترکہ تہذیب کی خوبصورت مثالیں موجود ہیں۔منفی نظریات کے تیزی سے پھیلنے کے باوجود معاشرہ زیادہ تر مثبت رویے کا حامل ہے۔عصر حاضر کے سیاسی مسائل، طلباء کی سرگرمیاں، یونیورسٹیوں میں سیاست، مندروں اور مسجدوں پر ہورہی سیاست اور صحافت کی بدلتی ہوئی سوچ کو طنز کا نشانہ بنایا گیا ہے صحافت جس طریقے سے خبریں عوام تک پہنچا رہی ہے اور جس طرح سے روز ٹی وی چینل پر بحث مباحثہ ہوتا ہے وہ کسی ایک نظریاتی سوچ کو فروغ دے رہے ہیں اس ضمن میں قیدار کہتے ہیں:

> ''میڈیا چور ہے لکھا ہوا ہے اس کی بھری واشنگ ہوئی ہے ہے تم لوگ اندھے نہ بنو یاد کرو یہی میڈیا تھا ہماری آپس کی قومی زندگی کی یہی دھوپ چھاؤں تھی موافق اور مخالف دونوں طرح کے لوگ ہیں پر اترتے تھے بھینسیں ہوتی تھی مگر اینکر جگہ نہیں بن جاتا ٹی وی پر اب نیوز چینل سے زیادہ دہ ویوز چینل دکھائی کہتے ہیں اور زیادہ تر اینکر مدعوین کو اپنے نقطہ نظر کی حمایت پر مجبور کرتے ہیں یہ صحافت نہیں زور آوری ہے اس کا کسی صحافی کو حق نہیں ہے''۔[۷]

۱۹۸۰ء کے بعد لکھنے والوں میں ایک اہم نام اقبال مجید کا بھی ہے۔انہوں نے ''کسی دن'' اور ''نمک'' جیسے اہم ناول لکھے۔ان کا ناول ''کسی دن'' ۱۹۹۷ء میں شائع ہوا۔اس ناول میں سیاسی، سماجی اور بدلتی ہوئی قدروں کو موضوع بنایا گیا ہے

آج ہمارا معاشرہ جس مراحل سے گزر رہا ہے اور کس طریقے سے سیاست مختلف صورتوں کے ساتھ سامنے آرہی ہے یہاں ایک ایسے ہندوستان کی کہانی ہے جو شہر تک محدود نہیں بلکہ دیہات کی سماجی پیچیدگیوں کو بھی ملحوظ خاطر رکھا گیا ہے۔ ناول بدلتے ہوئے ماحول میں انسان کی ذاتی حرص، بے ایمانی اور اخلاقی قدریں کس طرح تیزی سے پامال ہورہی ہیں اس کا بیان کرتا ہے۔ ناول میں شوکت جہاں ،قدرت اللہ اور پرتاب شکلا کے کردار اہم ہے۔ ناول کا بنیادی فوکس سماجی سطح پر ہونے والی تبدیلیوں پر ہے۔ ناول میں متوسط مسلمان گھرانے کی زندگی کا تجزیہ کیا گیا ہے ناول میں کرداروں کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف ہونے والی سیاسی بدامنی کو موضوع بنایا گیا ہے مصنف کے نزدیک مسلمانوں کو موجودہ سیاست کی فرقہ وارانہ تصادم سے دور رہنا چاہیے اور مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ہندوستان کی مٹی سے جڑے رہیں۔اس ناول پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر احمد صغیر یوں رقمطراز ہیں:

> ’’اقبال مجید ان کرداروں کے ذریعے نہ صرف مسلم ذہنیت یا مجبوری کی طرف اشارہ کرتے ہیں بلکہ موجودہ مسائل کی طرف بھی قاری کا دھیان کھینچتے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ہندوستان کی فرقہ پرست سیاست سے الگ رہے اس میں اس کی بھلائی ہے اس ناول کا سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کو ہندوستان کی مٹی سے جڑنا چاہیے۔خالص اسلامی تشخص سے اب بات بننے والی

نہیں ہے صرف کی نہیں تہذیب کی یہ تبدیلی سیاست کے ساتھ
سماجی کی یہ ترقی احساس کا یہ بدلہ بھی اس ناول کا حصہ ہے کہ اس کے
بغیر سیاست کی اونچ نیچ کو بھی سمجھا نہیں جا سکتا''۔۸؎

یہ ناول الیاس احمد گدی کا ناول'' فائر ایریا'' بھی بہت مشہور ہوا۔ دراصل سرمایہ دارانہ نظام پر مبنی ہے جہاں سب سے زیادہ مزدور طبقہ پسا جاتا ہے یہاں آگ کو مختلف معنوں میں استعمال کیا گیا ہے یہ آگ کہیں مزدور کے دلوں کے اندر نظر آتی ہے جو اپنے استحصال کو کسی بھی قیمت پر برداشت نہیں کرنا چاہتے ،کہیں یہ آگ ضمیر فروشی کی صورت میں نظر آتی ہے،کہیں یہ آگ سہد یو اور دیگر مزدور کے یہاں بغاوت کی صورت میں دیکھنے کو ملتی ہے جس کو بجھانے کی لاکھ کوشش کی جاتی لیکن یہ ایک ایسی آگ ہے جو ہر دور کے اندر کسی نہ کسی صورت میں سلگتی ہوئی نظر آتی ہے۔ ناول میں مزدوروں کی غربت اور اس غربت سے پیدا شدہ مسائل کو بھی موضوع بنایا گیا ہے کس طرح مزدور طبقہ کی بے حرمتی ہوتی ہے اور سرمایہ دارانہ کا نظام کس حد تک ان کا استحصال کرتا ہے:

''غریب چھوٹا اور نیچ انہیں بھگوان نے نہیں بنایا ان کو نیچے
گرایا گیا ہے ان کا استحصال کیا گیا ہے ان کو بھوکا اور ننگا رکھ کر سود
میں جکڑ کر بیگار لے کر مار پیٹ کر اس حد تک پہنچا دیا کہ وہ کیڑے
بھرے عام کھانے پر آمادہ ہو گئے ساری سماجی ،معاشرتی اور تہذیبی

تصوران کے یہاں مفقود ہوگیا صرف ایک بات وہ جانتے ہیں کہ
زندہ رہنا ہے جو ایک جانور جانتا ہے یہ سب ایک دو سال یا دس سال
میں نہیں ہوا بلکہ ہزاروں سال سے چلتا رہا ہے۔''۹؎

یہ ناول غریبوں اور مزدوروں کی کسمپرسی کی المیائی داستان ہے جہاں اپنے حق کے لیے آواز اٹھانے کے لئے قتل کیا جاتا ہے یہ ایک ایسے نظام کی کہانی ہے جو ظلم و جبر اور بربریت سے بھرا ہوا ہے جہاں انسان کی کوئی حیثیت نہیں جس کا وجود سرمایہ داروں کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتا بلکہ وقت آنے پر اس عام انسان کو موت کے گھاٹ اتار کر اپنا مقصد پورا کرتے ہیں۔ ناول میں مختلف کردار نظر آتے ہیں ان میں سہدیو، کالا چند، مجمدار، عرفان، ختونیاہ وغیرہ شامل ہیں۔ یہ ناول ایک طرف انسان کی بے ضمیری اور علامت کا استعارہ ہے تو دوسری طرف اس میں غربت کے سبب جو سمجھوتے انسان کو کرنے پڑتے ہیں اس کی طرف بھی اشارہ کیا گیا ہے۔

''فائر یا ایریا'' ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا اس ناول پر مصنف کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ یہ ناول دراصل چھوٹا ناگپور کے گاؤں جھریا کی کہانی بیان کرتا ہے یہاں مختلف شہروں اور گاؤں سے مزدور کام کرنے کے لیے آتے ہیں لیکن سرمایہ داران کی بے بسی شرافت اور معصومیت کا ناجائز فائدہ اٹھا کر ان کا استحصال کرتے ہیں لیکن ان غریبوں اور مزدوروں کے پاس کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہوتا کہ بھوک مٹا سکیں ناول کے ابتدائیے میں مصنف یوں رقمطراز ہیں:

''یہ سب کون لوگ تھے یہ بھوکے ننگے جانوروں کی طرح
زندگی گزارنے والے لوگ یہ مقامی باشندے بھی تھے اور ایسے بھی جو
دور دراز کے علاقوں سے آئے تھے اپنے کھیت اپنا گھر اپنا علاقہ چھوڑ
کر ان بے زمین لوگ بھی تھے اور چور اچکے بھی تھے اور ایسے معصوم
بے ریا اور سیدھے سادے لوگ بھی جن کی معصومیت پر فرشتے رشک
کریں یہ سب اس ویران چٹیل میدان کی تپتی دھوپ میں چٹانوں
سے آزما کرنے والے لوگ کون سی چیز انہیں کھینچ لائی ہے ان تمام
لوگوں میں صرف ایک چیز مشترکہ ہے بھوک۔''[۱۰]

اس ناول کی زبان سادہ اور سہل ہے مصنف نے اس ناول میں ہندی الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے۔ یہ ناول اپنے عہد کے سیاسی سماجی حالات کا بھرپور نقشہ کھینچتا ہے۔ دور حاضر میں اردو ناول اپنے وسیع تر معنوں میں زندگی کی ترجمانی کر رہا ہے موضوعاتی اعتبار سے بھی ناول میں وسعت پیدا ہو رہی ہے لیکن ناول اپنے بنیادی موضوع کے ساتھ معاشرے کی حقیقی تصویریں بیان کر کے ارتقا کی منزلیں طے کر رہا ہے اس ضمن میں اسلم آزاد اپنی کتاب میں یوں رقمطراز ہیں:

''ناول کے فن کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس کے ذریعہ حقائق
حیات کی آئینہ پائی ہو ناول کا فن انسانی معاشرے کی سرگرمیوں اور
ان سے پیدا ہونے والی مختلف النوع کیفتوں کی عکاسی کرتا ہے۔ یعنی

ناول بنیادی طور پر تخیلات سے زیادہ تجربہ اتحیات کا چور رکھتا ہے
ناول نگار محض خواب و خیال کی باتوں کو پیش نہیں کرتا بلکہ خواب و
خیال کو بھی حقائق زندگی کے لیے استعمال کرتا ہے۔''[11]

اقبال مجید کے علاوہ گیان سنگھ شاطر کا نام بھی ناول کے میدان میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ان کا ناول ''گیان سنگھ شاطر'' ۱۹۹۴ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک سوانحی ناول ہے جس میں مصنف نے اپنے اور اپنے اہل خانہ کے بارے میں کھل کر لکھا ہے یہ ناول اسی بے باکی اور صاف گوئی کے سبب مشہور ہوا اور گیان سنگھ کو اس ناول کو پر ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ یہ ناول جذبات نگاری اور منظر نگاری کا خوبصورت مرقع ہے۔ ناول میں مصنف اپنے وجود کو منحوس بتاتا ہے دراصل یہ وہ باتیں ہیں جنہیں ہر شخص عیاں نہیں کرنا چاہتا لیکن مصنف نے کھل کر ان تمام باتوں کو بیان کیا ہے ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''میری زندگی کی سب سے مضحکہ خیز بات یہ ہے کہ میری
بدبختی یہ ہے کہ لاعلمی اور بے کسی کے باوجود میرا نام گرو گرنتھ میں
سے استخارہ دیکھ کر گیان سنگھ رکھا گیا۔''[12]

گیان سنگھ شاطر کے اس ناول میں پنجاب کی زندگی، رہن سہن، رسم و رواج کے ساتھ ساتھ گاؤں اور قصبوں کے معاملات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ ناول کی زبان اور اسلوب بے حد معنی خیز ہے یہی وجہ ہے کہ اس ناول کا

مطالعہ کرتے وقت پنجاب کی تصویر قاری کے سامنے آجاتی ہے۔ یہ ایک سوانحی ناول ہے لیکن باوجود اس کے مصنف نے اپنی خانگی زندگی کو خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ناول صرف مصنف کی خانگی زندگی کی بیانیہ کیلئے مشہور نہیں ہوا بلکہ اس کے علاوہ بھی ناول میں پنجاب کی زندگی، زبان، اسلوب، فقرے، محاورے کو جس بے ساختگی کے ساتھ پیش کیا ہے وہ بھی اس ناول کی کامیابی کا اہم ذریعہ ہیں۔ اس ناول پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر احمد صغیر اپنی کتاب میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''گیان سنگھ شاطر نے جو انداز اس ناول میں اپنایا ہے اسے لکھنے کے لیے ہمت کی ضرورت ہے دلکش اور شیریں لہجہ لطیف اور بیانیہ اسلوب حقیقت پر مبنی واقعات منظر نگاری ایسی منظر نگاری جو حیران کر دے۔ کردار نگاری ایسی کی اس کردار کو دیکھنے کا دل چاہے دوسروں پر انگلی اٹھانا بہت آسان ہے ہے لیکن میں لکھنا بہت مشکل ہے کیونکہ کوئی نہیں چاہتا کہ اپنے گھر اور اپنے لوگوں کی برائی لوگوں کے سامنے آئے لیکن گیان سنگھ شاطر نے حوصلہ رکھا کی سوانح انداز میں اپنے بارے میں اور اپنے گھر والوں کے بارے میں وہ تصویر پیش کی ہے جس کو ہر کوئی چھپانا چاہتا ہے یہی اس ناول کی انفرادیت ہے اور پڑھنے پر مجبور کرتا ہے۔'' [۱۳]

رحمٰن عباس کا نام بھی نئے لکھنے والوں میں اہمیت کا حامل ہے یہ ایک ایسا

ناول نگار ہے جن کے یہاں موضوعاتی سطح پر تنوع دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان کے اب تک پانچ ناول منظر عام پر آ چکے ہیں جن میں ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی''، ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی''، '' روحزن''، ''نخلستان کی تلاش میں'' اور'' زندیق'' قابل ذکر ہیں۔ ''روحزن'' پر انہیں ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ یہ ناول اپنے عہد کے سیاسی سماجی اور مذہبی زندگی کے معاملات کو بیان کرتا ہے ساتھ ہی بمبئی کے پراسرار زندگی کے واقعات کو بھی جزئیات نگاری کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ ناول کی کہانی اسرار اور حنا کے گرد طواف کرتی ہے۔ ناول میں مذہب اور اس سے متعلق پیدا شدہ غلط فہمیوں کا بھی ازالہ کیا گیا ہے۔ ناول میں آزاد پرست لوگوں کی سوچ، مذہبی انتہا پسندی اور دقیانوسی جیسے موضوعات بھی نظر آتے ہیں وہیں دوسری طرف ناول زندیق ان کے بلند خیال اور وسیع مطالعہ کا ثبوت فراہم کرتا ہے یہ ناول مذہبی انتہا پسندی، نسلی برتری، فرقہ واریت جیسے موضوعات کا احاطہ کرتا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار ثنااللہ ہے جس کے ذریعے برصغیر میں مذہبی انتہا پسندی کے سبب عمل میں آنے والی بربریت اور تشدد کو دکھایا گیا ہے۔

۱۹۸۰ء کے بعد اُردو ناول نگاری کا منظر نامہ بالکل الگ ہے۔ موضوعاتی اور تکنیکی اعتبار سے معاصر اُردو ناول میں نئے نئے تجربے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آج کا ناول نگار کسی بھی موضوع کو شجرِ ممنوعہ نہیں سمجھتا ہے۔ فنی اور موضوعاتی اعتبار سے معاصر اردو ناول میں نئے نئے تجربے دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ان میں بیان

کی سادگی ، کہانی پن ، اسلوب ، علامت اور استعاورں کا استعمال ،تکنیک میں نئے تجربات ،حقیقت کی عکاسی وغیرہ شامل ہیں۔معاصر اردو ناول کے موضوعاتی تنوع سے متعلق پروفیسر قمر رئیس لکھتے ہیں:

''ان میں اقلیتوں کی پیچیدہ مسائل ، دلت طبقہ کی مزاحمتانہ تگ و دو ،فرقہ پرستی کا عفریت ، سیاسی بدعنوانیاں ، انتظامیہ کی بد کرداریاں ، گاؤں کی زندگی میں نئی ہلچل ، صارفیت اور عالم کاری کا بڑھتا سیلاب ، نوجوانوں کے مسائل ،تہذیب اور اقدار کا بحران ، انسانی رشتوں اور تصورات کی آویزش میں شدت جیسے انگنت پہلو ناول نگاروں کی توجہ کا مرکز رہے ہیں۔ یہ بھی لگتا ہے کہ ان پر انہوں نے خاصی ژرف نگاہی سے غور کیا ہے یا ایسی کوشش کی ہے۔اسلوب و اظہار کے تجربے بھی ان ناولوں میں قاری کو ایک نئی فضا سے آشنا کرتے ہیں۔'' [۱۴]

دورِ حاضر میں ناول نگاری کے ارتقا میں جن لوگوں نے اہم رول ادا کیا اور جنھوں نے وقت کی تیز رفتاری، مشینی زندگی ، میڈیا کی کرشمہ سازی ،جنسی مسائل ، اصلاحی و سماجی موضوعات اور مسلمانوں کی موجودہ صورت حال کو اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ان میں عبدالصمد، حسین الحق ،شموئل احمد ، ترنم ریاض، شائستہ فاخری، نورالحسنین ، مشرف عالم ذوقی ، قمر جمالی ، صادقہ نواب سحر ، پیغام آفاقی، غضنفر،

یعقوب یاور، خالد جاوید وغیرہ کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

شموئل احمد کا نام اہمیت کا حامل ہے۔ان کا پورا نام شموئل احمد خان ہے۔ان کے آباء واجداد کا تعلق پٹھان قبیلے سے تھا۔ان کے آباء واجداد تقریباً ۲۰۰ سال پہلے اپنے ملک افغانستان سے ہجرت کر کے ہندوستان کے صوبہ بہار میں آباد ہو گئے۔ شموئل احمد کی پیدائش ۱۹۴۳ء میں بھاگل پور میں ہوئی۔ان کے والد کا نام جمیل احمد خان تھا جو پیشے سے مجسٹریٹ تھے۔شموئل احمد کی ابتدائی تعلیم ایک جگہ پر نہیں ہوئی ہے کیونکہ ان کے والد ملازم تھے اور ملازمت کے سلسلے میں ان کا تبادلہ مختلف جگہوں پر ہوتا رہتا تھا۔ جہاں بھی اان کا تبادلہ ہوتا تھا اپنے بچوں اور بیوی کو ساتھ لے جاتے تھے۔شموئل احمد نے ۱۹۵۸ء میں بہار اسکول بورڈ سے میٹرک پاس کیا اس کے بعد ان کو ایسے اساتذہ ملے جھوں نے ان کے ذہن کو سمجھا اور اس کو وسعت بخشی ۔ان کو ادب کے ساتھ بچپن سے ہی دلچسپی تھی اسی وجہ سے انہوں نے بچپن ہی سے کہانیاں لکھنا شروع کر دی تھی۔۱۹۶۸ء میں انجینر نگ کی ڈگری حاصل کی۔ڈگری حاصل کرتے ہی انہوں نے پرائیوٹ کمپنی میں ملازمت اختیار کی۔ پانچ سال پرائیوٹ ملازمت کرنے کے بعد ۱۹۷۳ء میں حکومتِ بہار نے اسٹنٹ انجینیر کی ملازمت ملی۔ترقی کرتے کرتے چیف انجینر کے عہدے پر فائز ہوئے۔

شموئل احمد ادب کی دنیا میں ایک فکشن نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔مغرب و مشرق کے تقریباً ہر بڑے فنکار کا مطالعہ کر

چکے ہیں ۔انہوں نے مغربی ادب کا بھی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے جس سے وہ زیادہ متاثر نظر آتے ہیں ۔اردو فکشن میں یہ منٹو اور عصمت چغتائی سے متاثر نظر آتے ہیں ۔شموئل احمد نے اُن موضوعات کو فوقیت دی جن کو عصمت اور منٹو نے برتا تھا۔لیکن ان کا اثر قبول نہیں کیا خود کہتے ہیں ’’اگر میں کسی ادیب سے متاثر ہونے لگتا ہوں تو میں اسے پڑھنا چھوڑ دیتا ہوں‘‘۔شموئل احمد کو بچپن سے ہی شاعری کا لگاؤ تھا لیکن کبھی شاعری نہیں کی۔شاعری میں ان کو غالبؔ ،فیضؔ اور نصیر احمد وغیرہ کی شاعری بہت پسند ہے۔

شموئل احمد کو بچپن سے ہی ادب کے ساتھ لگاؤ تھا اس لئے کم سنی میں ہی لکھنا شروع کر دیا تھا۔ حالانکہ انہوں نے اردو زبان کی تعلیم باقاعدہ حاصل نہیں کی۔ انہوں نے چھٹی جماعت میں ہی اپنی پہلی کہانی ’’ چچا کے تاج‘‘ لکھی جو روز نامہ صدائے عام میں شائع ہوئی جو پٹنہ سے نکلتا تھا۔ان کی دوسری کہانی ’چاند میں داغ‘‘ جو ماہنامہ ’صنم‘ میں شائع ہوئی ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ۱۹۷۷ء میں منظر عام پر آیا۔ان کا دوسرا افسانوی مجموعہ ’’سنگھاردان‘‘ ہے جو ۱۹۹۶ء میں شائع ہوا۔تیسرا اور آخری افسانوی مجموعہ ۲۰۰۲ء میں شائع ہوا جس کا نام ’’القمبوس کی گردن‘‘ ہے۔ شموئل احمد کو افسانوں کے ساتھ ساتھ ناول نے شہرت بخشی۔ان کے تین ناول شائع ہوئے۔جن میں پہلا ناول ’’ندی‘‘ جو ۱۹۹۹ء میں نقاد پبلی کیشنز سے ہی شائع ہوا۔ ان کا دوسرا ناول ’’مہاماری‘‘ جو ۲۰۰۳ء میں نقاد پبلی کیشنز سے شائع ہوا۔ان کا تیسرا

ناول ''گرداب'' ہے۔ان کو 'ندی' کی بدولت شہرت ملی اسی لئے ان کے تمام ناولوں میں ''ندی'' اہم مقام رکھتا ہے۔ یہ ناول جنسی نفسیات پر مبنی ہے ۔اس ناول میں انہوں نے بدلتے ہوئے سماج میں عورت اور مرد کے آپسی رشتے کو موضوع بنایا ہے ۔اس میں انہوں نے اس بات کو واضح کیا ہے کہ عورت ایک ندی ہے جو کسی طرح کی رکاوٹ اور پابندی کو برداشت نہیں کر سکتی ہے۔اس ناول میں انہوں نے عورت کی نفسیاتی کشمکش کو پیش کیا ہے کہ کس طرح عورت شادی کی پہلی رات سے ہی مرد کے ساتھ ایڈجسٹ کر رہی ہے۔

''مہاماری'' ان کا دوسرا ناول ہے۔اس کا موضوع ''Corruption'' ہے ۔اس میں شموئل احمد نے یہ باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ کورپشن کی مہاماری ہر طرف پھیل گئی ہے اور ہم سیاسی نظام کے خلاف سوائے احتجاج کے اور کیا کر سکتے ہیں۔ ۱۹۸۰ء کے بعد مرد فنکاروں کے ساتھ ساتھ خواتین بھی اپنی خدمات انجام دی رہی ہیں اس ضمن میں صادقہ نواب سحر کا نام اہمیت کا حامل ہے۔صادقہ نواب سحر نئے لکھنے والوں میں اپنی منفرد شناخت قائم کرنے میں کامیاب نظر آتی ہے ۔انہوں نے اپنی تخلیقات میں جدید دور کے مسائل کو پیش کیا ہے۔ان کی ذہنی صلاحیت اور بلند افکار پر بات کرتے ہوئے عزیز شیخ لکھتے ہیں:

> ''صادقہ نواب سحر ایک بہترین فنکار ہی نہیں بلکہ جذبات کو سمجھنے والی ، دلوں کو پرکھنے والی اور زندگی کی گہرائیوں کا پیمانہ صحیح

طریقے سے بھر بھر کر لُٹانے کی صلاحیت رکھنے والی سچی اور بہترین
کاری گر ہیں''۔۱۵

صادقہ نواب سحر کو ایک ورسٹائل مصنفہ کہا جا سکتا ۔ انہوں نے بیک وقت ادب کی مختلف اصناف سخن میں نہ صرف طبع آزمائی کی ہے بلکہ اس شعبۂ میں اپنی ایک معیاری شناخت بھی قائم کی ہے۔ انہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ دیگر زبان و ادب کی بھی خدمت کی ۔ ان کا تعلق جنوبی ہند کی اس سرزمین سے ہے جو اپنی ایک منفرد ادبی اور افسانوی شناخت رکھتی ہے ۔ انہوں نے جنوبی ہند کی مختلف زبانوں سے استفادہ کیا پھر ایک مدت تک مہاراشٹر میں قیام کے سبب مراٹھی زبان پر بھی قدرت حاصل ہے اسی وجہ سے ان کی تخلیقات میں مراٹھی ادب کی جھلک نظر آتی ہے اور یہ جھلک ان کی تحریروں میں خوبصورتی پیدا کرتی ہے۔ صادقہ نواب سحر یوں تو افسانہ نگار، شاعرہ، ڈرامہ نگار، تنقید نگار، مترجم کی حیثیت سے بھی جانی جاتی ہیں لیکن ناول نگاری میں ان کا مقام بلند ہے۔ ان کا پہلہ ناول ''کہانی کوئی سناو متاشا'' ۲۰۰۸ء میں شائع ہوا۔ یہ ناول ابتدا ہی سے مقبولیت حاصل کرنے میں کامیاب رہا۔ یہ ناول ایک متاشا نامی عورت کے کردار کے ارد گرد گھومتا ہے ۔ جو مرد اساس سماج Male dominating sociecty کی چکی میں پستی ہے۔ اس ناول میں دکھایا گیا ہے کس کس طرح ایک عورت بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک سماج سے لڑتی ہے۔ ناول کے فلیپ کور پر ناول کے بارے میں کچھ اس طرح لکھا

گیا ہے:

''کہانی کوئی سناو متاشا' صادقہ کا پہلا ناول ہے۔ سماج میں
عورت کے استحصال کی داستان بڑی دل سوز ہے مگر جب کوئی عورت
اس تھیم کو بیان کرتی ہے تو اس کی شدت میں مزید اضافہ ہوتا ہے۔
'کہانی کوئی سناو متاشا' میں صادقہ نواب سحر نے ایک عورت کے
کرب و بے بسی کو اس پرُ اثر انداز میں بیان کیا ہے کہ مظلوم نسواں کی
ایک تصویر انکھوں میں گھوم جاتی ہے''۱۶؎

صادقہ نواب سحر کی تخلیقات کا مطالعہ کر کے عصری اگہی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے انہوں نے عصری مسائل اور رجحانات کو اپنے ناولوں کے ذریعہ پیش کرنے کی کوشش کی ہے ۔صادقہ نواب سحؔر نے اپنے ناول ''کہانی کوئی سناو متاشا''میں متاشا کے ذریعے جن نسوانی موضوعات و مسائل کو پیش کیا ہے۔ ان کا تعلق عام لوگوں اور متوسط طبقہ کی روزمرہ زندگی اور گھریلوں مسائل سے ہے۔جس کا بیان خوش اسلوبی سے کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور بہت حد تک کامیابی بھی ملی ہے ۔ اس ناول میں انہوں نے عصری حقائق کو سامنے لایا ہے ۔جن میں پیدائش کے بعد تین ماہ تک اپنے بیٹی کو نہ دیکھنا، بیٹی ہونے پر پورے خاندان کا دکھی ہونا اور پہلا بچہ بیٹا ہی ہونا جیسی خود ساختہ سماجی روایات کو دکھایا گیا ہے۔ یہ روایت ہمارے معاشرے کو گہن کی طرح کھائے جارہی ہے لیکن متاشا جیسی خواتین ان خود ساختہ

اصلولوں کوتوڑنے اوران جے جا خواہشات کے خلاف محاذ قائم کرنے میں لگی ہوئی ہے ۔ اس خلافت میں ان کو کتنے ظلم وستم اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہ متاشا کے کردار سے ظاہر ہوتا ہے۔اس ناول میں تخلیق کار نے وہ سماجی اور معاشرتی برائیاں کی جو آج تیزی سے ہمارے سماج میں پنپ رہی ہیں اور جن میں کئی طبقے مبتلا ہیں ۔۳۵۶صفحات پر مشتمل یہ ناول حالاتِ حاضرہ پر مبنی ہے۔

صادقہ نواب سحر کا دوسرا ناول ''جس دن سے'' ہے۔اس ناول کا موضوع انہوں نے کال سنٹر میں کام کرنے والے لڑکے اورلڑکیوں کی زندگی کو بنایا ہے۔ان کی زندگی کے تمام مسائل ، رہن سہن طورطریقے ، عادات واطوار کی تبدیلی سے پیدا شدہ حالات و کیفیات وغیرہ ہیں۔اس ناول کا مرکزی کردار جیتو ہے ۔ پورا ناول جیتو کی طربیاتی کیفیت کے بجائے المیاتی کیفیت کا اظہار ہے۔جیتو کا کردار اکیسویں صدی کی اس نسل سے تعلق رکھتا ہے جوفون ، لیپ ٹاپ ،انٹرنیٹ وغیرہ کواپنی زندگی کا اہم جز تصور کرتا ہے اور سماج اور معاشرے کے مروجہ اصولوں کے بجائے ان سب کے سہارے اپنی زندگی کوخوشگوار بنانے کی کوشش کرتا ہے۔اس ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح دیر رات تک پارٹی کرنا، فاسٹ فوڈ کھانا، زور زور سے میوزک بجانا وغیرہ نئی نسل کا طرۂ امتیاز بنتا جا رہا ہے اور اگر کوئی سمجھائے تو اسے اُلٹا سیدھا جواب دینا ، بڑے اور چھوٹے میں جواحترام ہوتا تھا وہ سب ختم ہورہا ہے۔ بڑا چھوٹے کواس لئے کچھ نہیں بولتا کیونکہ اسے پتہ ہے کہ اس

کے منع کرنے پر بھی وہ کون سا رُکنے والا ہے۔ ایسے میں بڑا اپنی بھلائی اسی میں سمجھتا ہے کہ دیکھ کر اندیکھا کرے جبکہ یہی ان دیکھی ہمارے سماج کو گھن کی طرح کھائے جا رہی ہے۔ آج کا انسان جس دور میں سانس لے رہا ہے وہ انانیت اور اجنبیت کا دور ہے یہ اسی دور کی کہانی ہے۔ اس کہانی کا قصہ تو مختصر ہے مگر ناول لمبا ہے۔ ٹوٹتے بکھرتے گھر میں بچے کی نفسیاتی حالت کیا ہوتی ہے یہ ناول میں دکھائی گئی ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا شمار اردو کے مشہور ناول نگاروں میں ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنا پہلا ناول ''عقاب کی آنکھیں'' صرف ۱۷ سال کی عمر میں لکھا۔ اب تک ان کے پچاس سے زائد کتابیں منظر عام پر آ کر اردو اور ہندی دونوں حلقوں میں شہرت حاصل کر چکی ہیں۔ مشرف عالم ذوقی کے مشہور ناول ''نالہ شب گیر''، ''عقاب کی آنکھیں''، ''شہر چپ ہے''، ''ذبح''، ''بیان''، ''پو کے مان کی دنیا''، ''مسلمان''، ''نیلام گھر''، ''لے سانس بھی آہستہ''، ''آتشِ رفتہ کا سراغ''، ''اردو''، ''اُڑنے دو ذرا'' ہیں۔ مشہور و معروف ادیب مشرف عالم ذوقی اردو دنیا ، میں ایک روشن ستارے کی طرح چمک رہے ہیں ان کی تخلیق کا عمل بہت وسیع ہے۔ ذوقی کا فن ان دنوں بلندی پر ہے یہ اردو زبان کی خوش نصیبی ہے کہ برسوں بعد اس زبان کو ان جیسا ادیب نصیب ہوا ہے۔

ناول ''پو کے مان کی دنیا'' ۲۰۰۴ء میں شایع ہوا، ایک انوکھا ناول ہے۔ اس میں انہوں نے عام بول چال کی زبان کو بڑے سلیقہ اور ہنرمندی سے استعمال کیا

ہے۔ یہ ناول موضوع کے اعتبار سے ایک مکمل ناول ہے۔ اس کا اگر کوئی دوسرا نام ہوتا تو شاید اپنا مفہوم واضح نہ کر پاتا مگر ''پو کے مان کی دنیا'' مناسب عنوان ہے۔ اس ناول میں مشرف عالم ذوقی نے آج کی تہذیب پر گہرا طنز کیا ہے۔ آج کے بچے اپنی تہذٰب سے بے نیاز ہیں اس ناول میں بتایا گیا ہے کہ انسانی وجود جس دن سے عمل میں آیا ہے۔ اس وقت سے ہی بھوک، ایک دوسرے کو جاننے کا تجس اور اپنے جذبات کو ترسیل کرنے کی خواہش نہیں بدلی۔ اس لیے حساس انسان آج کے سماج میں گھٹن محسوس کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار سنیل کمار رائے جو ایک جج ہے۔ وہ اپنے پیشے کا لبادہ اوڑھ کر جینا نہیں چاہتا ہے گھر کے ہر فرد نے یہ بھلا دیا ہے کہ وہ بھی ان ہی کی طرح ایک انسان ہے وہ بھی ایک عام انسان کی طرح سوچتا ہے، اس کے پاس بھی جذبات ہیں خواشہات ہیں۔ وہ ایک شوہر ہے، باپ ہے، دوست بھی ہے۔ مگر افسوس اس سے بات کی جاتی ہے تو صرف ایک جج مان کر مصنف نے انسان کے اس کرب کو محسوس کیا ہے کہ بڑے سے بڑا آدمی چاہیے کسی بھی عہدے پر ہو وہ پہلے ایک انسان ہے۔ اس کے پاس وہی خواہشات و جذبات ہیں جو عام انسان کی ہوتی ہیں وہ بھی اپنے آپ کو بیان کرنا چاہتا ہے۔ اسی بات کو ذہن میں رکھ کر مصنف کے دو تہذیبوں کے ٹکراؤ کو بیان کیا ہے۔

آج کے بچے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے عہد میں پیدا ہو رہے ہیں تو یہ Entertainment کے نئے نئے میڈیا روز بروز ان کا استقبال کرتے نظر آتے

ہیں۔آج کا بچہ بچہ ہونے کے تمام احساس سے دور نکل چکا ہے۔اس ناول میں ایک تیذ یب کا زوال اور دوسری تہذیب کا عروج بہت ہی خوبصورت انداز میں دکھایا ہے۔اس ناول کا ایک کردار ماضی کا دامن چھوڑ کر نئی روایتوں کو اپنا تا ہے تو دوسرا کردار اپنے ماضی کا دامن نہیں چھوڑ تا ہے ۔ ناول میں سیاسی وسماجی دونوں طرح کے مسائل اور کمزوریوں کو نشانہ بنایا گیا ہے اور ان مسائل پر قاری کا ذہن مرکوز کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

مشرف عالم ذوقی کا ایک اور ناول'' آتش رفتہ کا سراغ'' ہے ۔ یہ ناول ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا۔۲۰۷صفحات پر مشتمل ایک ایسا ناول ہے جس میں آگ ہی آگ ہے ۔یعنی ہمارے وقت کا کتنا بڑا المیہ پوشدہ ہے۔ ذوقی صاحب نے اس ناول میں دردمندی اور جرائت سے اپنے وقت کی بھیانک داستان کو ہم تک پہچانے کی کوشش کی ہے۔ یہ ناول مسلمانوں کے درد کو بیان کرتا ہے۔اس ناول میں ذوقی مسلمانوں کے مسائل کو لے کر کافی فکر مند نظر آتے ہیں۔اس ناول کے ذریعے مصنف نے کئی سوالات اقلیت کے حوالے سے اُٹھائے ہیں ۔جن کا جواب دیتے وقت تمام سیاستدان ،سوشل ریفارمر اور مذہبی پیشوا گونگے نظر آتے ہیں یہ ناول اردو ناول کی دنیا میں ایک روشن قندیل کی حیثیت رکھتا ہے۔اس ناول کی ابتدا بابری مسجد کے فیصلے سے ہوتی ہے۔اس ناول کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

''شہر چپ ہے'' ذوقی کا ایک اور ناول ہے جس کا موضوع غور وفکر سے تعلق

رکھتا ہے۔اس میں انہوں نے دکھایا ہے کہ کس طرح انسان کی زندگی میں میڈیا اپنی تمام تر آلہ کار کے ساتھ موجود نظر آتی ہے۔انسان نے اس سے اپنا رشتہ اس طرح لازم و ملزوم کر لیا ہے کہ موجودہ دور میں یہ تمام شعبۂ ہائے زندگی پر مسلط ہو چکی ہے۔ یہ ناول اسی حقیقت کو عیاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔انسانی ذہن کی ترقی اور میڈیا کے بڑھتے ہوئے نیٹ ورک سے آج پوری کائینات ہمارے کمرے تک سمٹ کر رہ گئی ہے۔لیکن اس کے فوائد کے ساتھ ساتھ اس کا غلط استعمال بھی ہو رہا ہے جس سے بچنا ضروری ہے۔اس کے اثرات بچوں پر کس طرح پڑتے ہیں اسے اس ناول میں دکھایا گیا ہے۔

''نیلام گھر'' بھی مشرف عالم کا ایک اچھا ناول ہے جس میں دورِ حاضر کے متعدد مسائل اس طرح پیش کئے ہیں کہ یہ مسائل بظاہر ایک دوسرے سے الگ ہونے کے باوجود ایک تسلسل میں عصری بحث ہے۔سیاست کی شوریدگی بھی موضوعِ گفتگو بنی ہے۔ معاشرے کے کئی مسائل بھی ہیں اخلاقیات، نسائی تقدس ،جنس ، فسادات یہ سب امور ایک فکری ترفع کے ساتھ ناول کے ناگزیر حصے بن گئے ہیں ۔ اس ناول میں احتجاج کا مضبوط اور بااثر آہنگ ہے یہ انقلاب کا ایک منشور بھی ہے ۔ یہ ناول تحریک عمل رومانس ، سماجی شعور ،تعمیری رجحان ، آئیڈیالاجی اور Readability کے لحاظ سے ایک کامیاب ناول ہے۔

''مسلمان'' یہ بھی ذوقی کا ایک اہم ناول ہے اس میں دکھایا ہے کہ موجودہ

سیاسی دشواری نے مسلمانوں کو حاشئے پر لا کھڑا کر دیا ہے۔لمحہ فکر یہ اور مجبوری یہ ہے کہ جن سازشی اور برباد کرنے والی طاقتوں نے اسے انجام دیا ہے وہی مسلمانوں کو Main stream میں شامل ہونے کی دعوت بھی دے رہے ہیں۔ ذوقی نے اس ناول میں مسلمانوں کا مین اسٹریم سے کٹ جانے کے لیے خود مسلمانوں کو ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔اس ناول میں مصنف نے مسلمان کی حالت کیا ہے کن ذہنی تناؤ سے آج گزر رہا ہے ، سیاست نے کس طرح اسے گمراہ کیا ہے۔ ان سب سوالوں کا جواب دیا ہے جو اس سے پہلے کسی ہندی ناول میں نہیں آ سکا ہے۔

''لے سانس بھی آہستہ'' ذوقی کا یک مشہور ناول ہے جو ۲۰۱۱ء کو منظر عام پر آیا۔اس ناول کا کینواس اتنا بڑا ہے کہ انسان ابتدا یعنی اس زمانے میں جب کہ وہ وحشیوں کی طرح غاروں اور خطرناک بیابانوں میں زندگی بسر کرتا تھا اپنی نادانی کے باعث پھر سے اسی زندگی کی طرف جا رہا ہے۔ ذوقی نے اکیسویں صدی کی دوسری دہائی میں اپنے انداز کا یہ ناول لکھا آج کے قاری کی ذہن کی آبیاری کے لئے یہ ناول اپنی مثال آپ ہے۔ یہ ناول پڑھتے وقت قاریکے ذہن کو بوجھل نہیں لگتا ہے۔ اس ناول کو پڑھتے وقت تجسس بڑھتا جاتا ہے۔ اس ناول میں زندگی کے تمام پہلوؤں اور تہذیب کے نئے نئے رنگ وارد ہوتے جاتے ہیں۔ قاری سوچ بھی نہیں سکتا کہ ایک ہی ناول میں غلامی کا عکس ،آزادی اور تقسیم ،نفرت ،غریبی ، بےبسی ،فسادات اور تشدد وغیرہ موضوعات ناول کو بڑا بنا دیتے ہیں۔اس ناول میں ذوقی

کسی جگہ بھی موضوع سے الگ نظر نہیں آتے ہیں۔شروع سے لیکر آخر تک اس ناول میں لے سانس بھی آہستہ کی صدا گونجتی ہے۔ذوقی نے دنیا کو ایک گاؤں میں تبدیل کرنے والے نیٹ ورک کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔سائنس نے ایک طرف جہاں دنیا کو چھوٹے سے گاؤں میں تبدیل کیا وہیں اس کے منفی اثرات سے انسان اپنی تہذیب کھوتا جا رہا ہے۔اس نئی تیذیب میں انسان اپنے آپ میں سمٹ کر رہ گیا ہے اور اتنا خودغرض ہو گیا ہے کہ جنسی تکمیل کے لئے بھی فیملی میں ہی مطمئن ہونا چاہتا ہے۔ذوقی نے اس ناول میں بہت ہی شائستگی کے ساتھ ہمارا ذہن اس طرف موڑا ہے کہ معاشرے پر چھائی تاریکی کے لئے اصل ذمہ دار کون ہے؟

مشرف عالم ذوقی کے ساتھ پیغام آفاقی کا نام بھی ناول کے میدان میں معتبر مانا جاتا ہے انھوں نے بہت کم ناول لکھے ہیں۔ پیغام آفاقی نے یونیورسٹی کے زمانے میں ایک ناولٹ ''راگنی'' کی تخلیق کی مگر وہ شائع نہیں ہو سکا۔پیغام آفاقی کا ناول ''مکان'' ایک مکان مالک اور اس کے کرایہ دار کی کہانی ہے۔کرایہ دار ''کمار'' اپنی مکان مالک ''نیرا'' کو اس کے مکان سے بے دخل کرنا چاہتا ہے۔ نیرا ایک شریف لڑکی ہے۔ وہ میڈیکل سائنس کی طالب علم ہے۔جس پر گھر کی ساری ذمہ داری ہے۔کمار نے غلط طریقہ سے سارے گھر پر قبضہ کر لیا ہے اور نیرا سے مکان خالی کرنے کے لئے تمام غلط حربے استعمال کرتا ہے۔مردانہ بالا دستی کے باوجود نیرا اس سے مسلسل ٹکراتی رہتی ہے۔کمار اور نیرا کے بیچ جد و جہد اور احتجاجی رویوں کی

سرگزشت کا نام ''مکان'' ہے۔ اس جد و جہد میں نیرا اپنے ایمان، صداقت اور استقامت کے ذریعے کامیاب ہوجاتی ہے۔

بنیادی طور پر اس ناول میں دو اہم کردار نظر آتے ہیں۔ نیرا اور کمار۔ نیرا کا کردار ایک ذمہ دار، با ہمت اور ایک نڈر لڑکی کا ہے جو اپنے مکان کے لئے ایک ایسے شخص کا مقابلہ کرتی ہے۔ جو انتہائی پست درجے کا کردار ہے خودغرضی کے لئے وہ بدترین حرکت کرنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔ اس کردار کو دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالباً پہلی بار کسی ناول نگار نے ایسا نسوانی کردار پیش کیا ہے جو مردانہ قوت کا مقابلہ اپنی حکمت، صلاحیت اور ذہانت سے کرتی ہے۔ نیرا کے مقابلے میں کمار کی شخصیت بالکل متضاد ہے۔ وہ بے حس، مطلب پرست اور بے ایمان قسم کا انسان ہے۔ جو مکان کو حاصل کرنے کے لئے کچھ بھی کرنے کو تیار تھا۔ 'مکان' میں پیغام آفاقی جذبات کو اس خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں کہ بظاہر تو یہ سیدھے سادے لگتے ہیں۔ مگر قاری کے دل پر ایک انمٹ نقش چھوڑ جاتے ہیں۔ اس ناول میں نہ فنی بازی گری کی جھلکیاں نظر آتی ہیں اور نہ نظریاتی وابستگی کی نعرے بازیاں۔ کسی بہت ہی گہرے اور فلسفیانہ موضوع پر یہ ناول نہیں لکھا گیا ہے۔ تکنیک سیدھی سادی ہے اس میں کوئی انوکھا تجربہ استعمال نہیں کیا گیا ہے۔ مگر احتجاج اور حالات سے لڑنے کی جو جرت مندانہ کوشش اس ناول میں زرّیں لہروں کی طرح دوڑتی رہتی ہے۔ وہ اس کے اسلوب کو اور خوبصورت بناتی ہے۔

اس ناول میں پیغام آفاقی نے سادہ زبان و بیان کا استعمال کیا ہے اور ایسی تشبیہات استعمال کرتے ہیں۔ جو ان کی تقریباً تمام ناولوں میں ملتی ہیں۔ پیغام آفاقی اپنے ناول میں کسی بھی تشبیہ کو برائے تشبیہ استعمال نہیں کرتے بلکہ اس کی مدد سے حقائق میں جان ڈالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیغام آفاقی کے دوسرے ناول کا نام ''پلیتہ'' ہے۔ جہاں تک اس ناول کا موضوع ہے تو اس کا کینوس بہت وسیع ہے اور ملٹی ڈائی من شنل ناول ہے۔ رحمٰن عباس اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

> ''اس ناول میں تاریخی کردار اور کالا پانی کی سزا کی تفاسیر سے مصنف نے استفادہ کرنے کے بجائے ایک فراموش کردہ ' سازش کے طور پر فراموش کردہ' حقیقت کو دریافت کرنے کی کوشش کی ہے جس کے توسط سے مصنف یہ بات بیان کرنا چاہتا ہے کہ جو حقیقت ہمارے عہد میں اسٹبلیش کی جاتی ہے ممکن ہے کہ وہ جھوٹ ہو اور یہ جھوٹ اقتدار کی لیباریٹری میں پالیسی کے تحت تیار کیا جاتا ہے۔ اگر کسی کو سچ کا عرفان ہو جائے تو اس کا انجام وہی ہوتا ہے جو خالد سہیل کا ہوا ہے۔ 'پلتیہ' سنجیدہ سیاسی ناول ہے۔ جس پر مکالمہ لازمی ہے۔'' ۱۷

پلیتہ ۶۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جس کے بارے میں مشرف عالم ذوقی نے بجا فرمایا ہے کہ 'پلیتہ' میں آپ نئی صدی کی بازگشت کو بہ آسانی محسوس کر سکتے ہیں۔ یہ

بازگشت کالا پانی کی سزا کاٹنے والے افراد، انگریز سامراج کی سیاہ کاریاں اور اس پس منظر میں موجودہ سماجی اور سیاسی زندگی کی سنگلاخی اور سفا کی کا قصہ ہے۔

شائستہ فاخری کا نام بھی ۱۹۸۰ء کے بعد لکھنے والوں میں اہمیت کا حامل ہے۔ شائستہ فاخری کے اب تک تین ناول ''شہر سے کچھ دور'' ۲۰۱۲ء، ''نادید بہاروں کے نشان'' ۲۰۱۳ء اور ''صدائے عندلیب برشاخ شب'' ۲۰۱۴ء میں شائع ہو چکے ہیں۔ ناول ''شہر سے کچھ دور'' کا موضوع شہر اور گاؤں کے بیچ ایک بستی کی زندگی کے ان حالات کو احاطہ کرتا ہے جہاں لوگ جینے کا ہنر تو جانتے ہیں لیکن اپنے وجود سے بے خبر رہتے ہیں۔ ممکن ہے لوگ یہ سوال کریں کہ بستی بھی تو گاؤں کی طرح ہوتی ہے لیکن میرا خیال ہے کہ بستی میں شہر اور گاؤں کی زندگی کا ملا جلا ماحول ہوتا ہے اور یہاں اگر شہری زندگی کے مزے دیکھنے کو ملتے ہیں تو کچھ گاؤں کی زندگی پسماندگی بھی۔ بیک وقت ان دونوں سرحدوں کے درمیان زندگی جینے کی امنگ اور زندگی سے جنگ میں کتنے مرحلے آتے ہیں، ان سب کا بیان اس ناول کا بنیادی موضوع ہے۔

''نادید بہاروں کے نشان'' شائستہ فاخری کا دوسرا ناول ہے۔ جس میں ایک عورت علیزہ کے نشیب و فراز کو پیش کیا گیا ہے۔ علیزہ کی ایک سہیلی تانیہ ہے جو اس کی صحیح رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ فرحان اور اعیان دو مرد کے درمیان علیزہ کی زندگی ڈوبتی ابھرتی رہتی ہے۔ علیزہ کی شادی فرحان سے ہوتی ہے لیکن فرحان اسے ہمیشہ

شک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے۔اس پر ہمیشہ نگاہ رکھتا ہے۔اس کے اندر ایک کسک ہے جس کا اظہار ان الفاظ میں کرتا ہے۔مردوں کی بے وفائیوں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ ہمارے ابو میں کوئی بری لت نہیں تھی مگر پھر بھی انہوں نے امی کے ساتھ وفا نہیں کی۔فرحان نے اپنے باپ کی صفائی دیتے ہوئے یہ بھی سمجھایا کہ بعض دفعہ ایسا ہوتا کہ ہم بغیر سوچے سمجھے ایسے کام بھی کر ڈالتے ہیں جن کی سنجیدگی کو ہم پوری طرح نہیں سمجھ پاتے۔ ہمارے اندر گہری تاریخ اور پرُ اصرار قوتیں ہیں۔جن کے ہاتھوں میں ڈوریاں ہوتی ہیں اور ہم بے بس سے کٹھ پتلیوں کی طرح ان کے اشارے پر رقص کرنے لگتے ہیں بغیر جانے ہی یہ عمل کیوں اور کیسے کر رہے ہیں۔

فرحان کا ایک چچا زاد بھائی بھی ہے اعیان جو فرحان سے کافی مختلف ہے۔ اعیان اور علیزہ دونوں کے مزاج ملتے جلتے ہیں۔اس لئے تانیہ نے کہا تھا تمہاری شادی اعیان کے ساتھ ہونی چاہئے تھی لیکن فرحان کو قطعی پسند نہیں تھا کہ علیزہ اعیان سے زیادہ نزدیک ہو یہی وجہ تھی کہ فرحان اسے اعیان سے دور رکھنا چاہتا تھا۔

اعیان کے والدین کی سر پرستی چھین جانے کے بعد چچی کی محبت نے اسے سیراب تو کیا مگر وہ محبت بھی اسے غصے میں ملی۔اعیان اس گھر کا وفادار تھا اور گھر کے افراد کی تمام باتیں سرخم کر کے تسلیم کرتا۔فرحان جہاں علیزہ اور اعیان کو نزدیک ہوتے دیکھتا کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے علیزہ کو الگ کرنے کی کوشش کرتا۔ چاہئے وہ ساتھ فلم دیکھنے کا معاملہ ہو یا راحت کے یہاں دعوت میں جانے کا موقع۔یہ ناول

عورت کے درد و کرب کو پیش کرتا ہے کہ مرد جب چاہئے کسی عورت کو طلاق دے دے اور جب چاہے حلالہ کروا کر اسے اپنے نکاح میں لے لے۔ یعنی عورت کا کوئی اپنا وجود نہیں۔ ایک خریدا ہوا کھلونا ہے جسے جب چاہا کھیلا اور جب چاہئے پھینک دیا۔ یہ ناول عورت اور مرد کے رشتے کو اجاگر کرتا ہے لیکن علیزہ کا کردار کوئی خاص تاثر پیدا نہیں کرتا۔

شائستہ فاخری کا دوسرا ناول ''صدائے عندلیب برشاخ شب'' ہے۔ اس میں بھی عورت کی بے بسی ور اس پر ظلم کا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ نازنین اس ناول کا مرکزی کردار ہے جو راوی کے طور پر پورا قصہ بیان کرتی ہے۔ نازنین کی شادی کاشف اصغر سے ہوتی ہے جو گلف میں نوکری کرتا ہے اور ہر مہینے موٹی رقم بیوی کو بھیجتا رہتا ہے۔ اس کے پاس آرام و آرائش کی تمام چیزیں موجود ہیں۔ ناول کے بارے میں احمد صغیر نے لکھا ہے:

> ''ناول ''صدائے عندلیب برشاخ شب'' کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ناول مردوں کے خلاف ایک احتجاج ہے لیکن میں ایسا نہیں ہے۔ کیا عورت اپنی بربادی کا خود ذمہ دار نہیں۔ نیفیو کے حاملہ ہونے میں کیا اس کی مرضی شامل نہیں تھی اور نازنین اس کا اسقاط حمل کیوں کرواتی ہے۔ اس کی شادی اس لڑکے سے کیوں نہیں کروائی جس نے اس کی زندگی برباد کی تھی''۔ [۱۸]

یہ ناول اپنے زبان و بیان کے لحاظ سے بہتر ہے اور مصنفہ نے عورت کی بے بسی کو بڑے دلکش انداز میں پیش کیا ہے۔شائستہ فاخری کے ساتھ قمر جمالی بھی مقبول ومعروف فکشن نگار ہیں ۔قمر جمالی کو زمانہ طالب علمی ہی سے پڑھنے لکھنے کا بے حد شوق تھا۔قمر زیادہ تر انگریزی ادب کا مطالعہ کرتی تھیں۔جس کے باعث ان کے خیالات وافکار میں کافی وسعت اور پھیلاؤ پیدا ہوا۔انگریزی ادب کے مطالعے کے باعث ان کے اسلوب میں جدت طرازی کا حسن پیدا ہوا۔انجمن ترقی پسند مصنفین سے منسلک ہونے کے سبب قمر کی شخصیت اور فن پر اسکا اثر بھی رونما ہوا۔قمر جمالی کے ادبی سفر کا با قاعدہ آغاز ''اے چاند چھپ نہ جانا'' سے ہوا جو ایک عشقیہ موضوع پر مبنی کہانی ہے جو ایک ہفتہ وار اخبار'' رسالہ روداد حیات'' دہلی میں ۱۹۶۶ء میں چھپا تھا۔اس وقت قمر جمالی کی عمر۱۴سال تھی۔اس کے بعد ان کی دوسری کہانی ''فاصلے مٹ گئے''۱۹۶۹ء میں رسالہ ''بیسوی صدی'' میں دہلی سے شائع ہوئی۔پھر ان کے قلم میں توانائی آئی اور وہ افسانہ نگاری کی طرف باقاعدگی سے توجہ دینے لگیں۔ہندوستان کے تمام معتبر اور معروف رسائل کے علاوہ پاکستان کے رسالہ بادبان، سخنور، منشور میں ان کی کہانیاں شائع ہوکر ان کے نام کی مہر ثبت کی ہے۔

قمر جمالی بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔لیکن قمر جمالی ان تخلیق کاروں میں ہیں جنھوں نے ناول اور افسانہ دونوں کے تئیں حق ادا کیا ہے۔قمر جمالی نے ''آتش دان'' لکھ کر اپنی تخلیقیت اور فنی بصیرت کا مسلّم ثبوت ادبی دنیا کو فراہم کیا ہے۔ان

کے ناول ''آتش دان'' میں تقریباً تمام خوبیاں بدرجہ اتم نظر آتی ہیں۔'آتش دان' نہایت ہی سہل اور آسان زبان میں لکھا گیا ہے جس میں وقت کے فلسفے کو ایک لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے اور اشاروں کنایوں میں زندگی کے فلسفے کو سمجھایا گیا ہے۔قمر جمالی کا یہ پہلا ناول ہے۔اب تک انہوں نے صرف افسانوی ادب تخلیق کیا ہے۔اصولی طور پر اس ناول میں افسانوی رنگ زیادہ ہونا چاہئے تھا لیکن ایسا نہیں ہے۔انہوں نے اس میں ایک نئے موضوع کو جگہ دی ہے۔گاؤں کے کسانوں کی مظلومیت اور انانیت اور سیاست دانوں کی غنڈہ گردی ،دولت اور قبیلے کے بل بوتے پر ڈکٹیٹر شپ کی چکی میں پسے ہوئے عام انسان کو موضوع بنا یا گیا ہے۔ناول نگار نے ایک چھوٹے سے دیہات کے ذریعہ ہندوستان کی سماجی ، سیاسی اور معاشی زندگی کو پیش کیا ہے۔قمر جمالی نے ناول ''آتش دان'' کے ذریعہ یہ بات باور کرانے کی کوشش کی ہے کہ جدید ہندوستان میں جا گیرداروں اور سرمایہ داروں کی جگہ سیاسی لیڈروں نے لے لی ہے۔''آتش دان'' زندگی کے رزمیہ ہی کو پیش نہیں کرتا بلکہ رزمیہ کے ساتھ ایک نظریہ اور فلسفہ کو بھی پیش کرتا ہے۔ یہ ناول ایک مزدور کے روز مرہ اور اس کی عام زندگی جو اسی کشمکش میں گزر جاتی ہے کہ کب اس کا نفس روٹی کے ٹکڑے سے سیر ہو جائے۔

پلاٹ کے اعتبار سے بھی یہ ناول اہم ہے ۔ ناول کا پلاٹ سیدھا سادا اور منظّم ہے، واقعات کی کڑیاں ایک دوسرے میں اس طرح پیوست ہیں کہ قاری کا

تاثر شروع سے آخر تک برقرار رہتا ہے۔ کہانی میں تجسس اور دلچسپی بھی آخر تک قائم رہتی ہے۔ اسی طرح ناول میں کردار نگاری بھی بڑی عمدگی سے کی گئی ہے۔ ناول میں ہمیں جیتے جاگتے، زندہ اور متحرک کردار ملتے ہیں۔

قمر جمالی نے مکالمہ نگاری میں بھی اپنی فن کاری کا اچھا مظاہرہ کیا ہے اور ہر کردار کی زبان سے ایسے مکالمے ادا کروائے ہیں جو بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ منظر نگاری کے بھی بہترین نمونے اس ناول پیش کیے ہیں۔ انھوں نے ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو قصے سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ ناول ''آتش دان'' کا اسلوب بیان نہایت سلیس، سادہ اور آسان ہے۔ مصنفہ نے ناول میں تخلیقی اور معیاری زبان کا استعمال کیا ہے۔ جس میں اردو کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان کے الفاظ بھی موقع اور محل کے مطابق استعمال ہوئے ہیں۔ حسین اور دلکش تشبیہات واستعارات، ضرب الامثال، کہاوتیں اس ناول میں بڑی عمدگی سے پیش کیے گے ہیں۔ قمر جمالی کا ناول ''آتش دان'' فنی نقطہ نظر سے کامیاب ناول ہے۔ انھوں نے اس ناول میں اپنی تمام صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کی کوشش کی ہے۔ زبان و بیان ہو یا تکنیک ناول پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ ہو جاتا ہے کہ انھوں نے بڑی فن کارانہ چابک دستی سے کام لیا ہے۔ موضوعات و مسائل کی حقیقت پسندانہ عکاسی کی وجہ سے یہ ناول قاری کو پڑھنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ قمر جمالی نے اس وقت مارکسی نظریہ کو احیائے نو بخشا جب ہمارا اردو ادب نئے نظریات کے دھندلکوں میں کہیں گم

ہو گیا تھا اور حقیقت نگاری کے بجائے غیر منکشف چیزوں پر زور دیا جاتا تھا۔قمر جمالی کا ناول ''آتش دان'' اسی فلسفۂ حیات کی ایک عمدہ مثال ہے جس میں زندگی کی پیچیدگیوں کو پیش کیا گیا ہے۔شمس الرحمان فاروقی ''آتش دان'' کے بارے رقمطراز ہیں:

''موضوع کے اعتبار سے یہ مجھے بالکل نیا ناول معلوم ہوا۔گاؤں کے کسانوں کی مظلومیت، مقامی غنڈہ گردی اور سیاست اور حکومت کے جوڑ توڑ کو خوبی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ناول کا پلاٹ اگرچہ مربوط ہے مگر بیان کی کمزوری، مکالموں کی تکرار اور مناظر کی یک رنگی اس کے فطری بہاو میں خارج ہوتے ہیں۔لفظ گیٹ کو انھوں نے ہر جگہ مونث لکھا ہے بہتر ہے کہ انہیں اگلی اشاعت میں درست کر لیا جائے۔ان باتوں کو نظر انداز کر دیں تو ناول اچھا ہے اور دلچسپ یقیناً ہے۔بڑی بات یہ ہے کہ یہ ایک نئے موضوع کو فکشن کے خطے میں لاتا ہے۔''[۱۹]

قمر جمالی ایک ایسی نسائی آواز ہے جو اپنی تحریروں کی وساطت سے اردو دنیا میں اپنی پہچان بنانے میں کامیاب نظر آتی ہیں۔ان کے فن پاروں کی زبان نہایت شستہ اور معیاری ہے۔وہ الفاظ کو نگینوں کی صورت میں جڑنا جانتی ہیں۔ان کا ذوقِ جمال ان کے ناول ''آتش دان'' میں نکھر کر سامنے آیا ہے۔''آتش دان'' میں جاگیر

دارانہ ظلم وجبر ،اعلیٰ افسر شاہی ، معاشرتی نظام اور سیاسی اور سماجی حال کی حقیقی تصویر کشی کی گئی ہے ۔ انھوں نے اپنے ناول میں پیچیدہ لب و لہجے سے گریز کیا ہے۔انھوں نے اپنے ناول میں کہیں کہیں تلگو اور انگریزی زبان کے الفاظ کا استعمال کیا ہے جو ناول کے اسلوب میں چاشنی پیدا کر دیتے ہیں۔ چھوٹے چھوٹے جملے یا فقرے ایک صوتی آہنگ پیدا کر دیتے ہیں۔کہانی میں ان کا لب و لہجہ سادہ اور سپاٹ ہے۔ انھوں نے تمام واقعات کا گہرائی سے مشاہدہ کر کے انسانی فطرت کے تمام اسرار و رموز کی مضبوط گرہیں کھولنے کی سعی میں اپنی کہانی کا تانا بانا تیار کیا ہے۔''آتش دان'' بلا شبہ عصر حاضر کا ایک اہم ناول ہے، جو قمر جمالی کی تخلیقی صلاحیتوں کی غمازی کرتا ہے۔

مختصراً کہا جاسکتا ہے کہ ۱۹۸۰ء کے بعد لکھنے والوں کی جو پوداُ بھر کر سامنے آئی انہوں نے ناول کو ایک نئ سمت بخشی جس میں نئ زندگی کے نئے امکانات تھے ساتھ ہی ناولوں میں موضوعات کے ساتھ ساتھ فن اسلوب زبان و بیان ہیئت اور تکنیکی سطح پر بھی تبدیلی نظر آتی ہے اردو ادب میں اچھی خاصی تعداد میں ناول سامنے آئے ہیں یہاں گوپی چند نارنگ کی اس بات سے بالکل اتفاق کیا جاتا جاسکتا ہے کہ اکیسویں صدی فکشن کی صدی ہے۔

حوالہ جات

۱۔ ہندوپاک میں اردو ناول تقابلی مطالعہ، از انور پاشا، پیش لفظ، شعر پرنٹرز دہلی، ۲۰۰۸ صفحہ نمبر ۷

۲۔ اردو ناول آزادی کے بعد، ڈاکٹر اسلم آزاد، جہاد نکھار پریس، 1981 ص ۳۴

۳۔ دوگز زمین، عبدالصمد، نصرت پبلشرز لکھنؤ 1988 نمبر ۲۴

۴۔ دوگز زمین عبدالصمد نصرت پبلشرز لکھنؤ 1988 ص ۲۷۷

۵۔ دیویانی، غضفر، پریس علی گڑھ صفحہ نمبر ۵

۶۔ فرہات، حسین الحق، تخلیق کار پبلشرز، نئی دہلی 1992

۷۔ اماوس میں خواب، حسین الحق، ، آفسیٹ پرنٹرز دہلی، ص ۳۱۷

۸۔ اردو ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ کے بعد، ڈاکٹر احمد صغیر، ص ۱۲۴

۹۔ فائر ایریا، الیاس احمد گدی، معیار پبلی کیشنز نئی دہلی، ۱۹۹۴، ص ۰۷

۱۰۔ فائر ایریا، ابتدائیہ، الیاس احمد گدی۔ ۱۹۹۴ ص ۸

۱۱۔ اردو ناول آزادی کے بعد، ڈاکٹر اسلم آزاد، نگار پبلی کیشنز یوپی۔ ۱۹۸۰ ص ۱۱

۱۲۔ گیان سنگھ شاطر، گیان سنگھ شاطر، اُشناک اینڈ اروند، نئی دہلی، ۱۹۹۴، ص ۲۲۱

۱۳۔ ناول کا تنقیدی جائزہ ۱۹۸۰ کے بعد، احمد صغیر، افق پرنٹرز دہلی۔ ۱۹۹۷

۱۴۔ ہم عصر اردو ناول۔ ایک مطالعہ، مرتب قمر رئیس، ص ۵۱، ۱۶

۱۵۔ صادقہ نواب سحر شخصیت اور فن، فکشن کے تناظر میں، پروفیسر تراب علی یدالہی، محمد اسلم نواب، ص ۵۶

۱۶۔ فلیپ کور ناول 'کہانی کوئی سناؤ متاشا، صادقہ نواب سحر

۱۷۔ https://paighamafaqui2.blogspot.com

۱۸۔ اردو ناول کا تنقیدی جائزہ، ۱۹۸۰ کے بعد، احمد صغیر، ص ۳۴۰

۱۹۔ شب خون خبر نامہ، جنوری تا مارچ ۲۰۱۴، ص ۲۴

باب سوم

رحمٰن عباس کی تخلیقات کا تجزیاتی مطالعہ

ناول وہ نثری قصہ ہے جس میں انسانی زندگی کے واقعات کو حقیقی لبادہ پہنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ ناول میں حقیقی زندگی کی تصویر دیکھنے کو ملتی ہے، داستان کے مقابلے میں ناول ایک نئی صنف تھی یہی وجہ ہے کہ اس کا نام ناول پڑا دراصل ناول اطالوی زبان کا لفظ ناویلا سے نکلا ہے جس کے معنی نئے کے ہیں لیکن ناول اور داستان میں جو مشترکہ چیز ہمیں نظر آتی ہے وہ قصہ ہے، ہاں اتنا ضرور ہے کہ یہ قصہ نوعیت کے اعتبار سے مختلف ہوتا ہے۔ اُردو ناول کا اغاز نذیر احمد کے ہاتھوں 1869 ء میں ہوا۔ انہوں نے ''مراۃ العروس'' لکھ کر اس صنف کی بنیاد ڈالی اس کے بعد اردو ناول نے ارتقاء کی منزلیں طے کیں۔ ناول کا کینوس بہت وسیع ہے اس میں زندگی کے واقعات کو باریکی سے بیان کرنے کی گنجائش ہوتی ہے اس ضمن میں سہیل بخاری یوں رقم طراز ہیں:

> ''ناول میں زندگی کے مرقع پیش کیے جاتے ہیں ۔موضوع کے اعتبار سے اس کا میدان بہت وسیع ہے اتنا ہی وسیع جتنا خود زندگی، انسانوں کے افعال وقواعد، خیالات اور جذبات ،کامیابیاں اور ناکامیاں دلچسپیاں اور تفریح پریشانیاں اور دقتیں اور دانائیاں عظمت اور فرمائدگی یہ سب ناول کے موضوعات ہیں وہ ان سب کا تجزیہ وتحلیل ان کی وضاحت وتشریح اوران کی توجیہہ وتکمیل پیش کرتا ہے۔''[1]

اکیسویں صدی میں بھی ناول نے زندگی کی تمام کشمکش کو موضوع بنایا اور آج ناول نثر کی معتبر صنف کی صورت میں تسلیم کی جا چکی ہے ۔دراصل اکیسویں صدی میں معاشرے میں جس طریقے سے نئے خدشات اور خطرات پیدا ہو رہے ہیں اس سے انسانی وجود تذبذب کا شکار ہو رہا ہے ایک طرف مذہبی کٹر پن ،سیاسی انتشار اور گونا گوں مسائل اُبھر کر سامنے آ رہے ہیں وہیں دوسری طرف قومیت کا بھی منفی تصور اُبھر کر سامنے ارہا ہے جس نے انسانی زندگی کو بہت متاثر کیا ہے۔ اکیسویں صدی میں جن فنکاروں نے اپنے بلند فکر اور سماجی شعور کے ان نئے اُبھرتے ہوئے مسائل کا احاطہ کیا ہے ان میں رحمٰن عباس کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے دراصل رحمٰن عباس نئے لکھنے والوں میں ایک معتبر نام ہے جن کے اب تک پانچ ناول منظر عام پر آ چکے ہیں۔ انہوں نے اپنے ناولوں میں جنس اور محبت سے اُبھرنے والی کشیدگی کو موضوع بنایا ہے ساتھ ہی ان کے ہاں زندگی کو قریب سے قریب تر دیکھنے کی کوشش نظر آتی ہے اتنا ہی نہیں ان کے یہاں سوال کرنے کی بھرپور کیفیت نظر اتی ہے لیکن ان کا کمال یہ ہے کہ نہ صرف سوال کھڑا کرتے ہیں بلکہ زندگی کی گھتیوں کو بھی سلجھانے کی کوشش کرتا ہے اس ضمن میں ڈاکٹر عمر غزالی یوں رقم طراز ہیں:

''رحمٰن عباس کے ہاں استفہامیہ کا عروج جگہ جگہ نظر اتا ہے
مثال کے طور پر ان کے چند سوالات یہ ہیں لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟
رشتوں کی اساس کیا ہے؟ غایت منطق اور ضرورت کیا ہے؟ رشتوں

کے اہتمام اور پائیداری کا غیر لازمی جواز کیا ہونا چاہیے؟ رشتوں کا
کوئی غیر سماجی جواز ہے بھی یا نہیں؟ رشتوں کی نوعیت کس نے اور
تاریخ کے کن مراحل نے طے کی ہے؟ رشتوں کی عمر اور تاریخی
حقیقت فی نفس کیا ہے؟ رشتوں کا مابعدالطبعی تصور مذہب ہی کا دفع
کردہ ہے یا سماجی بھوک اور انحصار کی خواہش نے اسے جنم دیا
ہے؟ کیا ہمیشہ ایک عرصہ بعد ہر رشتہ بدنما داغ میں بدل جاتا
ہے؟ کیا رشتے کی خواہش سراب نہیں ہے؟'' ۲؎

مندرجہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ رحمٰن عباس نے اپنے ناولوں میں اس طرح کے سوالات اٹھائے ہیں دراصل یہ ایسے سوالات ہیں جو ہماری نفسیات کا حصہ ہیں ان کے ناولوں میں انسان کے وجود اور رشتوں کے پس منظر کی حقیقت پر لب کشائی دیکھنے کو ملتی ہے یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ رحمٰن عباس کے ناولوں کا بنیادی موضوع جنس اور مذہب ہے۔ ان کی تمام کہانیوں میں جنس اور مذہب سے اُبھرنے والی کشیدگی نظر آتی ہے دراصل جنس اور مذہب ہمارے معاشرے کا اٹوٹ حصہ ہے جن سے علیحدگی ہرگز ممکن نہیں لیکن رحمٰن عباس نے ایک طرف جہاں جنسی بے راہ روی سے پیدا مسائل کو موضوع بنایا ہے وہیں مذہبی کٹر پن سے پھیلنے والے انتشار کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔ ان کا پہلا ناول ''نخلستان کی تلاش'' اسی مذہبی انتہا پسندی کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ ان کا یہ ناول 2004ء میں

منظر عام پر آیا۔ناول پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔رحمٰن عباس نے بڑے خوبصورت انداز میں کہانی کے مرکزی کردار خالد کی توسط سے اپنے احساسات و جذبات کا ذکر کیا ہے ناول کے اغاز میں ہی قاری کو معلوم ہوتا ہے ان کی فکر کس نخلستان کی تلاش میں سرگردہ ہے دراصل ناول نگار نے ناول میں مسلم معاشرے کے ساتھ ہونے والی زیادتی کے ساتھ ساتھ دیگر اہم نکات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ رحمٰن عباس نے انسان کے اس تذبذب کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ اخر وہ کیا سوچتا ہے یہی وجہ ہے کہ کالج کی پڑھائی کے دوران یہاں کردار میں عشق اس طرح سرایت کیا ہوا نظر اتا ہے کہ وہ عشق کی پڑھائی کا طالب علم معلوم ہوتا ہے۔

''میرے اطراف عشق بہ صورت زہر اپنا حلقہ گہرا کرتا جا رہا تھا۔میرے اختیار میں یہ چمن کے اندرونی حلقے کی طرح اندر ہی اندر سیاہ ہوتا جا رہا تھا میرے اختیار میں یہ نہیں تھا کہ اسے باہر نکال سکوں لیکن مجھے یاد ہے جب کبھی کوئی شلوار مجھے یک چھوڑ کر کسی اور جزیرے کی سیر کے لیے نکل جاتی تب میرا دل بہت چاہتا کہ وہ رنگ مجھ پر چھا جائے جن کے سامنے میرے لب کھل نہیں سکے تھے وہ قوس قزح بن کر میرے اندر رجائیت کی طرح بھر دے وہ میرے اندر ایسے دھیرے دھیرے اترنے جیسے سمندر کی پرسکون موجوں سے

سرخ تابندہ سورج کی مسافت اترتی ہے۔''[۳]

رحمٰن عباس نے اپنے ناولوں میں اس طرح کے جذبات کا اظہار بڑے کھلے طریقے سے کیا ہے۔زیر بحث ناول میں بھی مصنف نے محبت اور جنس کے ایسے تعلق کو بیان کیا ہے اور محبت کے لیے جنس کی کارفرمائی کو لازمی قرار دیا ہے ساتھ ہی زندگی کی اصل شناسائی محبت کے ہی ذریعہ ممکن بتائی ہے اتنا ہی نہیں محبت اور بدن کے تصور کے بغیر زندگی کی لطافت کو ادھورا مانا ہے:

''محبت مرد کو طفل اور عورت کو دیوی بنا دیتی ہے محبت کا سرور واحد سرور ہے جو تنہائی کا تریاق بن سکتا ہے عورت کے بدن کا عرفان واحد عرفان ہے جو موت کے حسن کے راز اور خدا کے جواز کی منطق سے وجدان کو روشن کرسکتا ہے محبت کے بغیر انسان ہمیشہ آدمی ہی رہتا ہے اور بدن کی لذت کے بغیر عشق کفر ذات ہے بدن کی لذت سے متاثر اور متعدد لڑکیوں سے آشنائی نے غالباً مجھے زندگی سے آشنا کر دیا تھا۔''[۴]

ناول نگار جمال اور خالد کے کردار کے ذریعے انسانی وجود جس تذبذب کا شکار ہے اس کا المیائی اظہار کیا ہے یہاں ہندتوا سے اُبھرنے والی کٹر سوچ کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے ساتھ ہی کشمیر اور دوسری تمام جگھوں کے اقلیتی طبقے کے لیے بھی فنکار کی ہمدردی دیکھنے کو ملتی ہے ۔فسطایئت سے اُبھرنے والی نفرت نے جس

طریقے سے مسلم معاشرے میں تناؤ کو جنم دیا ہے وہ لمحہ فکریہ ہے۔مصنف نے ماضی اور حال کی خوفناک واقعات کی طرف بھی اشارہ کر کے اس بات کا ثبوت فراہم کیا ہے کہ کس طرح سے فسطائی طاقتیں وجود کے لیے خطرہ بنتی جارہی ہیں۔رحمٰن عباس نے مذہبی کٹر پن ،سیاسی تصادم، جمہوری نظام اور دیگر پہلوؤں کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ رحمٰن عباس نے جمہوریت اور سیکولرزم کو بھی اڑے ہاتھوں لیا ہے ساتھ ہی انہوں نے کرداروں میں جو وقت کے ساتھ نظریاتی تبدیلی اتی ہے اس کا بھی احاطہ کیا ہے ۔خالداور جمال کے کرداروں کے ذریعے مصنف نے اس تبدیلی کی بہترین ترجمانی کی ہے دراصل خالد مارکسزم سے متاثر تھا لیکن اچانک اس کے افکارونظریات میں تبدیلی دیکھنے کوملتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے یہاں مارکسزم سے مذہبی انتہا پسندی جنم لیتی ہے لیکن یہ انتہا پسندی بھی ایک منصوبے اور ردعمل کے تحت وجود میں آتی ہے یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا لازمی ہے کہ خالد حسین ہندوتو ا،اور دیگر جماعتوں کی انتہا پسندی اور اقلیتوں پر ہونے والے ظلم کے ردعمل میں انتہا پسندی کی راہ اختیار کرتا ہے تو وہیں جمال کا کردار بھی اسی طرح کے ردعمل کے طور پر سامنے آتا ہے دراصل ناول میں جمال کو مرکزی کردار کی حیثیت حاصل ہے اس کردار کے ذریعے مصنف نے جہاں ایک طرف نچلے طبقے کی مجبوریوں کو سامنے لایا ہے وہیں دوسری طرف انسانی وجود کے کرب کو بھی بیان کیا ہے جمال کے ذہن پر جہاں ماضی کے حالات کے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں دوسری طرف کشمیر کے اثرات اس پر

پڑتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اسے اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ فسطائی طاقتیں اوراس سے جُڑے ہوئے ادارے اس کے وجود کے لئے خطرہ ہیں:

''اس بصیرت نے مجھے فسطائی طاقتوں کے اداروں کے خلاف کھڑا کیا اور میرے مردہ شعور کو بینائی دی۔میں نے تاریخ ،سیاست اور فسطائی قوتوں کے عروج کے اسباب کو سمجھنا شروع کیا۔میری تاریخی حقیقت اوراس کے دفاع کی اہمیت سے مجھے محبت اور بدن کی لذت نے روشناس کیا ہے۔''۵

خالد کی موت کی خبر سننے کے بعد جمال کے یہاں بھی اپنے وجود کے تئیں مختلف افکار وخیالات نظر آتے ہیں یہ ایک ایسا کردار ہے جس کے اپنے والدین مار دیے گئے تھے اور بہن کی عصمت دری بھی کی گئی تھی ساتھ ہی کشمیر کے حالات نے انہیں جھنجھوڑ کر رکھ دیا، اس طرح جمال کبھی کشمیر سے پھر لوٹ کر نہیں آیا۔ناول میں طبقاتی اورنسلی برتری سے ابھرنے والے ان منفی اثرات کو بھی زیر بحث لایا ہے جس نے پورے برصغیر کو اپنے چنگل میں پھنسا دیا ہے ساتھ ہی اس نسلی برتری کے منفی اثرات ہندوستان کی سیاسی زندگی پر بھی پڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ناول نگار نے اس نقطے کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ کس طرح پچھلی تین دہائیوں سے ہندوستان میں اقلیتی طبقے کے ساتھ حق تلفی کی جارہی ہے۔مصنف نے فسطائیت کی طرز پر چلنے والے حکمرانوں کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے اتنا ہی نہیں جمہوریت کو افیون سے تعبیر کر

کے مجبور اور بے بس لوگوں کی المیائی صورتحال بیان کی ہے جن کو سیکولرزم کے
جھانسے میں لا کر استحصال کیا جاتا ہے:

''جمہوریت منشیات کی دکان ثابت ہوئی۔سیاسی مفاد، ذہنی
تشنج اور باطنی کرب ،شعر کا موجد بنا اور فرد کی بساط دل ہر طرح کے
استحصال کی تجربہ گاہ میں بدل گئی۔ جمہوریت ایک تیز تر کلوروفارم
ہے۔جس کے استعمال سے ہندوستانی عوام کو انسانی اقدار اور اصول
حیات سے بے خبر کر دیا گیا۔افراد کی مجموعی عدالت کو فراموشی کی اتھاہ
سمندر میں ڈوبا دیا گیا۔ جبر کے سمندری گھوڑے گانوں ،شہروں اور
گلی کوچوں کی شانتی کو روندتے ہوئے اور ہنہناتے ہوئے گاندھی کی
دھوتی پر حملہ آور ہوئے اب سڑکوں کے اطراف نالیوں میں ننگے
مفلس اور شکست زدہ گاندھی کبھی کبھی گرے ہوئے نظر آتے
ہیں۔''[۶]

ہندوستان کے موجودہ سیاسی نظام اور منظر نامے کو دیکھ کر ناول کا مرکزی
کردار اپنی قوم کو لے کر مایوس نظر آتا ہے دراصل جس طریقے سے کچھ برسوں سے
اقلیتی طبقے کو نظر انداز کیا جارہا ہے اور ان کی سیاسی اور سماجی تاریخ کو فراموش کیا جا
رہا ہے اس سے خالد کے یہاں اپنے طبقے کے تئیں کچھ کر گزرنے کی سوچ جنم لیتی
ہے اس سوچ کے پس پشت کئی وجوہات ہیں جن میں سے ایک وجہ یہ ہے کہ مسلمانو

ں کو مغل سمجھا جا رہا ہے:

''اور اس تاریخی جواز کی بنیاد پر ہم مثل ہندو معاشرے کا احیا ہو رہا ہے گویا ایک تاریخی انتقام لیا جا رہا ہے۔ہم نے اسرائیل کی تعمیر دیکھی ہے اور ہم ان دنوں سے بھی باخبر ہیں جب جرمنی نے اس یہود قوم پر رزق حرام کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس قوم کی معصوم کم عمر بچیوں کے نازک جسمانی حصوں کو گولیوں کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ وقت گزر گیا مگر ہر لحہ اپنی شدت کے ساتھ تاریخ کی آنکھوں کا حصہ بن گیا ہے اور تاریک انتقامی روداد ہے۔ یہ بہت ممکن ہے کہ یہود قوم اپنی تاریخ کی شکست اور بے غیرتی کا انتقام لے کیوں کہ سماجی زندگی کی سیاسی بنیاد ہی تاریخی تشخص کی تشفی پر ہے۔اور یہ زمین کا محوری نظام ہے۔''ے

ناول میں ڈر اور وحشت کی فضا نظر آتی ہے دراصل خالد اور جمال کے مکالمے اس بات کی طرف اشارے کرتے ہیں کہ جتنا ہم خاموش رہیں گے اتنا ہی فسطائی طاقتیں ہمارے وجود کو مٹانے کی کوشش کریں گے یہی وجہ ہے کہ خالد جمہوریت کے نظام کے خلاف آواز اُٹھاتے ہوئے نظر آتا ہے:

''خالد وحشی ہو گئے ہو؟

(اس کے چہرے پر دبیز مسکراہٹ کی لہر..)

کیا ہو گیا ہے؟ .... کیا کرنا چاہتے ہو؟ خالد کس طرف جا رہے ہو..؟

(وقفہ)

خالد بات کرو۔۔۔میں تم سے مخاطب ہوں۔۔ یہ سب کیا ہے۔؟

تمہیں اس ہتھیار کی ضرورت کیوں پڑ گئی۔۔۔خالد تم ادب کے طالب علم۔۔۔پھر

میں زندگی دیکھ رہا ہوں جی رہا ہوں مسلمان ہوں میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔۔میں نفی نہیں ہوں۔۔مجھے زندہ رہنا ہے میں زندگی دیکھ رہا ہوں۔۔لفظوں کی آڑی ترچھی سی لکیریں ہوا میں کھینچ کر وہ چپ ہو گیا۔''

تم زندہ ہو۔۔اور محفوظ ہو۔۔تمہیں کون مار سکتا ہے۔

وہ (اس نے اس قدر متانت کے ساتھ کہا گویا کوئی دشمن کی بیوہ کی سر شفقت کے ساتھ رکھ رہا ہوں۔)

کون ہو؟

وہ۔۔وہی لوگ!

کون لوگ۔۔خالد بتاؤ تمہیں اس طرح کا قدم ہرگز نہیں

اٹھانا چاہیے۔

وہ ہم سب سے طاقتور ہیں!''۔۸؎

ملک میں جمہوری نظام ہونے کے باوجود بھی اقلیتی طبقے پر تشدد ہو رہا ہے ۔یہاں سیکولرزم کے نام پر جو قتل و غارت ہوتی ہے اس کی طرف مصنف نے توجہ دلانے کی کوشش کی ہے:

''تو تو جمہوریت میں beleive کرتا ہے نا۔۔پھر تو کیوں روتا ہے؟ تو ..تو سیکولرزم اور آرٹ کا دیوانہ ہے نا۔۔تو کیوں روتا ہے؟ دکھ تو مجھے ہے کیونکہ میں صرف مسلم ہوں .بنیاد پرست تم کہتے تھے نا ..مجھے اپنی قوم کی تجدید اور بقاء عزیز ہے۔ یہ دکھ تو میرا ہے تو کیوں روتا ہے؟ ذلت ہار اور تباہی تو میری ہوئی ہے۔عزت میری بہنوں کی تار تار کی جاتی رہی ہے۔ تجھے کیا؟ پاگل (وہ پھر ہلکے ہلکے میرے بال کھینچ رہا تھا) پاگل مت رو۔رونے سے کچھ ملتا ہے؟ ایک بہن کی ذلت آمیز ہلاکت پر رو رہے ہو۔میری ہزاروں بہنوں کی عزت ترشول والوں نے خاک میں ملائی ہے مجھے تو خودکشی کر لینی چاہیے۔ پر نہیں میں زندہ رہوں گا۔میں قوم ہوں۔ میں بہت بڑی قوم ہوں۔میری جنگ وقت سے عظیم ہے۔''۹؎

مختصر طور پر کہہ سکتے ہیں کہ یہ ناول فنی اعتبار سے کمزور ہے ۔ناول میں

اشتعال انگیزی کے سبب ناول کا فن مجرح ہوا ہے دراصل یہ رحمٰن عباس کی ابتدائی کوشش تھی یہی وجہ ہے کہ اس ناول میں بہت سی کمزوریاں نظر آتی ہیں۔

ایک ممنوعہ محبت کی کہانی

''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' رحمٰن عباس کا دوسرا ناول ہے۔ یہ ناول 2009ء میں ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے شائع ہوا۔رحمٰن عباس نے اس ناول کا انتساب'' ان محبتوں کے نام جنہیں سماج ،مذہب اور اخلاقیات کے خود ساختہ دائرے قبول کرنے سے ڈرتے آئے ہیں، ان ادیبوں کے نام جو برصغیر کی مجموعی ثقافتی روایت کے دفاع میں سرگرم ہیں۔ یہ ناول جنس، محبت اور مذہبی انتہا پسندی کی ترجمانی کرتا ہے ساتھ ہی کوکن کی تہذیبی وثقافتی زندگی کا بھی آئینہ ہے۔ ناول میں جہاں مذہب کی شدت پسندی نظر آتی ہے وہیں دوسری طرف کوکن کے ایک گاؤں سورل کے بدلتے ہوئے سماجی، مذہبی ،معاشرتی اور ثقافتی زندگی کا المیہ بیان کیا ہے۔ ناول کا پلاٹ کچھ اس طرح ہے کہ ناول کی ہیروئن سکینہ ایک شادی شدہ عورت ہے جس کا شوہر مجاور حسین ایک تبلیغی جماعت کا سرگرم رکن ہے وہیں دوسری طرف کہانی کا مرکزی کردار عبدالعزیز سکینہ کے ساتھ جنسی رشتہ قائم کر لیتا ہے لیکن یہ جنسی رشتہ اتفاقی طور پر عمل میں اتا ہے لیکن یہ جنسی تعلق ان کے اندر ایک ایسے لطیف احساس کو پیدا کرتا ہے کہ وہ اس سے باہر نکل نہیں پاتا ہے دراصل عبدالعزیز کمسن لڑکے کا کردار ہے جو اپنی عمر سے بڑی عورت کے ساتھ جنسی رشتہ قائم کر لیتا ہے

اس کے جنسی رشتے کے عمل سے سکینہ کی گود ہری ہو جاتی ہے اور ایک بیٹے کو جنم دیتی ہے جس کا نام یوسف رکھا جاتا ہے۔ سکینہ کا شوہر مجاور حسین اس بیٹے کو اللہ کی طرف سے انعام تصور کر کے ایک دینی مدرسے کے حوالے کر دیتا ہے۔ ناول میں اس وقت ایک گہرا تصادم سامنے آتا ہے جب یوسف اور عبدالعزیز کے ہاں نظریاتی طور پر اختلاف سامنے آتا ہے دراصل یوسف مذہبی انتہا پسندی کہ سبب سورل کی مشترکہ تہذیب کو غلط قرار دیتا ہے وہیں دوسری طرف عبدالعزیز اس مشترکہ تہذیب کا علمبردار ہے اسی اختلاف کے سبب ایک روز یوسف کے ہاتھوں عبدالعزیز کا قتل ہو جاتا ہے۔

رحمٰن عباس اپنی کہانیوں میں زندگی سے جڑے ہوئے نظر اتے ہیں ان کی کہانیاں انسانی زندگی کے ان حقائق کو سامنے لانے کی سعی کرتی ہے جو مذہبی انتہا پسندی کا شکار ہوتی ہیں زیر بحث ناول میں مصنف نے کوکن کی تہذیبی اور تاریخی زندگی کے وجود پر جو خدشات اور خطرات اُبھر کر سامنے آرہے تھے ان کو پیش کیا ہے یہاں اس بات کا ذکر بھی ضروری ہے کہ مصنف نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کوکن کے آس پاس کے گاؤں کی مشترکہ تہذیبی زندگی کے مرقع بیان کیے ہیں یہاں روایتی محبت کی کہانی کے برعکس ایک ایسی محبت کی کہانی کو بیان کیا گیا ہے جس کا آغاز اور انجام حیران کن ہے دراصل عبدالعزیز کا کردار سکینہ کے مقابلے میں کافی نا پختہ اور چھوٹا ہے جو کم سنی میں حادثاتی طور پر سکینہ سے جنسی رشتہ قائم کر لیتا ہے لیکن

اس کے سبب عبدالعزیز کی زندگی میں ایک لطیف احساس اجاگر ہوتا ہے یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا لازمی ہے کہ سکینہ کو مجاور سے جو توقع تھی شادی کے بعد وہ توقعات پوری نہ ہونے کے سبب سکینہ کے ہاں غیر شعوری طور پر جنسی تسکین کا جو جذبہ ابھرتا ہے ایک روز عبدالعزیز کے ساتھ اس جذبے کو ایک نیا رنگ دیتی ہے:

> ''مجاور حسین کی سادہ مزاجی توکل اور نرمی اس کے لیے وہ اسم اعظم بن نہ سکا جو اس کی مرکز گزیدہ نسائیت کی خلش کو بھر پاتا اس کے اندر عدم تخلیقیت کا جو احساس تھا اس کے اندر جو زندگی کی سلک تھی اس کے اندر سارے موسموں میں محبت کی سیلوں پر مچلنے کی جو ترنگ تھی اس کے اندر محبت کی شیریں گفتگو جو نشہ تھا اس سے مجاور حسین کی دینی باتیں اور اصلاحی حکایات پورا کرنے سے قاصر تھیں''۔[۱۰]

ناول میں سکینہ کا کردار ایک ایسی عورت کا کردار ہے جو جنسی تسکین کے لیے کم عمر مرد کے ساتھ تعلقات قائم کرتی ہے لیکن شعوری طور پر وہ اپنے شوہر کو دھوکہ نہیں دینا چاہتی تھی حالانکہ عبدالعزیز سے جنسی تعلقات کے بعد ان کی گود ہری ہو جاتی ہے تو دوسری طرف اس کا شوہر مجاور اس ناجائز بچے کو خدا کا دیا ہوا انمول تحفہ تصور کرتا ہے:

> ''مجاور حسین سے جب سکینہ نے حمل ٹھہرنے کی بات کہی تھی

اس وقت ان کی دونوں آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔انھوں نے اس کی
پیشانی پر بوسہ لیا تھا اور فوراً شکرانہ کی نماز پڑھنے کے لیے کھڑے
ہوگئے تھے ان کے چہرے پر ایک مبہم مسکراہٹ پھیلی تھی۔نماز کے
بعد وہ دوبارہ اس کے ساتھ بیٹھ کر بہت ساری باتیں کرتے رہے
جس میں اس کے لیے ہدایات بھی تھیں کہ اب وہ کس طرح چیزوں کو
اٹھائے کس طرح چلے کس طرح کھانے پینے کا خیال رکھیو غیرہ
وغیرہ''۔[11]

ناول میں یوسف اور عبدالعزیز کے کردار میں تضاد پایا جاتا ہے یوسف مذہبی
انتہا پسندی کا اعلیٰ نمونہ ہے جو کوکن کے علاقوں میں پائے جانے والی مشترکہ تہذیبی
عناصر کو اسلام کے لیے خطرہ تصور کرتا ہے ساتھ ہی ان مشترکہ عناصر کو فروغ دینے
والوں کو بھی کافر سمجھتا ہے وہیں دوسری طرف عبدالعزیز کا کردار کوکن اور اس سے
جڑے ہوئے علاقوں کی مشترکہ تہذیبی عناصر کا سب سے بڑا پاسدار ہے جو اس کلچر
اور تہذیب کے فروغ میں تحریکات چلاتا ہے جو یوسف کو بالکل پسند نہیں آتا ہے
دھیرے دھیرے یوسف پر عبدالعزیز کے درمیان ایک جنگ چھڑ جاتی ہے نتیجے کے
طور پر یوسف کے ہاتھوں عبدالعزیز کا قتل ہوتا ہے لیکن قتل کوکن اور سورل کی مشترکہ
تہذیبی زندگی کا ہوتا ہے:

''یوسف نے غصے سے عبدالعزیز کے سر پر لات ماری اور

کہا'' کافروں کی وکالت کرتا ہے''۔ پردے کی مخالفت کرتا ہے۔ناچ گانے کو کلچر کہہ کر اس کی حمایت کرتا ہے۔دنیاوی تعلیم پر لوگوں کو اکساتا ہے۔اس کی بول اور ان دونوں کے درمیان کوئی گہرا رشتہ دکھائی نہ دیتا تھا۔ایسا لگتا تھا یہ جملے وہ اپنے ساتھیوں کو سنانے کے لئے ادا کر رہا تھا۔اس کے دل پر کسی زیادہ گہرے صدمے کا اثر تھا۔جھنجلاہٹ اور نفرت کی آگ میں یوسف کا سر چکرا رہا تھا۔اسے ماجرے کو طول دینے کی عادت نہ تھی۔اس نے جھک کر عبدالعزیز کی بائیں پسلی میں خنجر گھونپ دیا۔ایک بار گھمایا اور نکالا۔خنجر کے ساتھ ہی خون کا ایک چشمہ پھوٹ پڑا۔''[۱۲]

ناول کی زبان سادہ اور سلیس ہے ۔رحمٰن عباس کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے انداز بیان سے قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں اکثر کامیاب نظر آتے ہیں۔اس ضمن میں ڈاکٹر عمر غزالی اپنے مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

''رحمٰن عباس کا اسلوب بیان سلیس اور سادہ ہے مگر وہ لفظوں سے کھیلنا جانتے ہیں اس لیے لفظوں کو واقعات کے تحت بخوبی بھرتے ہیں مناظر کی عکاسی میں طاق ہیں روح کی کم اور جسم کی بات زیادہ سنتے ہیں جہاں روح جسم میں داخل ہو کر سکون کا باعث ہے مکالماتی انداز بیان ان کے ناولوں میں اکثر دیکھنے کو ملتا ہے جو دراصل ان کا

حسن ہے یہ انداز بیان ناول کومقبولیت بھی بخشتا ہے اور قاری کی توجہ
اپنی جانب مبذول کرتا ہے اس سے ترسیل میں آسانی ہوتی ہے اور
اکتاہٹ کا درانا ممکن نہیں ہوتا ہے اس طرح سے محویت طاری ہوتی
ہے''۔[۱۳]

رحمٰن عباس نے زیر بحث ناول میں انسانی نفسیات کا گہرا نقشہ کھینچا ہے یہاں سکینہ، عبدالعزیز اور مجاور کے کرداروں کوفطری طور سے برتا گیا ہے ایک طرف سماجی قید و بند میں مجبور سکینہ جس کا شوہر مذہبی جماعت کا اہم رکن ہے دوسری طرف اس کی جبلی خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے دکھایا ہے یہ ناول ایک طرف ان سماجی رویوں پر بھی گہرا طنز ہے جو انسان کو مذہب اور ذات میں تقسیم کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے ہیں اس انتہا پسندی کا سب سے بڑا نمونہ یوسف ہے جو کوکن اور سورل کی تہذیبی زندگی کا دشمن ہے لیکن وہیں دوسری طرف اس تہذیبی زندگی کا محافظ عبدالعزیز ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ ناول اپنے موضوع کے اعتبار سے عمدہ ہے ۔ساتھ ہی اس ناول میں محبت، جنس، مذہب کے تصادم سے اُبھرنے والی کشیدگی کو صاف دیکھا جا سکتا ہے محبت کی المیائی تصویر سکینہ اور عبدالعزیز کی صورت میں نظر اتی ہے جو لاکھ کوشش کے بعد اس تعلق کو کوئی نام نہیں دے سکتے ہیں ناول میں احتجاجی اور باغیانہ رویہ بھی نظر آتا ہے۔ ناول انسان کی ازلی جبلتوں کا بھی اظہار کرتا ہے ساتھ ہی یوسف جیسے منفی سوچ رکھنے والے کرداروں کا بھی احاطہ کرتا

ہے جو ہر چیز کو مذہب کی عینک سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ساتھ ہی ناول میں موسیقی،تہذیب اورنسل پرستی کے منفی تصور پر بھی گہرا طنز نظر آتا ہے:

''عرب نسل پرست ہیں اور دوسری تہذیبوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔تب عبدالعزیز نے خاموشی کو توڑتے ہوئے کہا ہاں۔یہ تو بہتان ہوا''ماہر نے اس کی طرف دیکھا اور جواب میں کہا ''ہاں میرے دوست! تاریخ اس بات کی گواہ ہے۔عرب جہاں جہاں گئے ہیں۔انہوں نے مقامی ثقافت کو یا تو مٹا دیا یا دوسرے درجے کی چیز بنا کر اس کا تمسخر اڑایا ہے۔عرب دوسرے افراد کی مذہبی زندگی کے منکر ہیں۔یہاں خود خطہ عرب میں رنگارنگ زبانیں اور ثقافتیں موجود تھیں جنہیں عربی اقتدار نے''جہالت کی نشانیاں کہہ کر رد کر دیا''اقتدار کا سب سے بڑا ہتھیار اس کی زبان ہوتی ہے۔''[۱۴]

زیر بحث ناول میں منظر نگاری کے اہم نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں دراصل ناول کا ایک اہم جز منظر نگاری یا منظر کشی بھی ہے۔ناول نگار کی کوشش یہی رہتی ہے کہ وہ زندگی کے مختلف حالات و کیفیات کا جو نقشہ کھینچتا ہے اس کی تصویر قاری کے سامنے آ جائے۔رحمٰن عباس کے ناولوں کی خوبی یہ ہے کہ وہ جس منظر کا بھی نقشہ کھینچتے ہیں اس کی جیتی جاگتی تصویر ہمارے آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔علی عباس حسینی منظر

نگاری کے متعلق یوں رقمطراز ہیں:

'' منظر نگاری کی وجہ سے زمان ومکان کی تعین ہوتی
ہے۔اوقات اور موسموں کا بیان ،کمروں اور مکانوں کے خاکے
،آبادیوں کے نقشے ،اسباب ضرورت و زینت کی تصویریں اور ناچ
رنگ ،میلوں ٹھیلوں،جلسوں جلوسوں کے معرکے اسی جزسے متعلق
ہیں۔ناول نگار کو چاہیے کہ وہ ان امور کو اس سلیقے اور اس انداز سے
بیان کرے کہ پڑھنے والے کے سامنے بالکل تصویر کھنچ
جائے۔شاعری میں اسی کو محاکات کہتے ہیں۔'' ۱۵؎

منظر نگاری کے اعتبار سے رحمٰن عباس کا ناول ''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی''
بہترین ناول ہے جس میں سورل اور کوکن کی تہذیبی زندگی کے اہم واقعات ہمارے
سامنے اتے ہیں ۔مصنف نے اس ناول میں ایسے مناظر کی تصویر کشی کی ہے جو قصے
سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔ دراصل ناول میں منظر نگاری جتنی بہترین ہو ناول اُتنا
ہی کامیاب مانا جاتا ہے:

''مئی کے آخری دن تھے۔دن بھر گرم ہوا چلتی رہتی البتہ
شام ہوتے ہوتے سمندر کی طرف سے آنے والی ہواؤں کے ساتھ
ٹھنڈے جھونکے بھی آجاتے اور ماحول قابل برداشت ہو جاتا۔دن
بھر کی گرمی میں پکے ہوئے آموں اور کاجو کے پھلوں کی مہک شام

کے ان جھونکوں میں زیادہ اچھی لگتی۔کوکن گرم مرطوب آب و ہوا
کا خطہ ہے جس کی کنارے کنارے بحرعرب کی لہریں صدیوں سے
ایک تاریخ کا قبرستان اپنے ساتھ لئے موجزن ہیں۔ایک ایسا
سمندر جس کا دوسرا کنارہ دوسری دنیاؤں کی پراسرار تہذیب سے جا
ملتا ہے۔بعض پرانے لوگوں کا یہ بھی کہنا ہے کہ موہن جودارو سے
ممنوع محبت کرنے والے جس گھرانے کو شہر بدر کیا گیا تھا دراصل
سب سے پہلے وہی اُس خطے میں آ بسا۔خلاف معمول اس شام
ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں میں ایک پراسرار گرم لہر تحلیل ہوگئی تھی۔بحر
عرب سے آنے والی ہواؤں سے زیادہ سندھ کی تپش کا ایک احساس
اس لہر میں پوشیدہ تھا جس میں بجائے آم اور کاجو کی مہک جنگلی
پیڑوں کی بوزیادہ تھی۔"[۱٦]

ناول میں مشترکہ تہذیبی زندگی کو ختم کرنے کی جو سازش نظر آتی ہے اس سے صاف جھلکتا ہے کہ ہمارا سماج کس دہانے پر کھڑا ہے اتنا ہی نہیں یہاں ان منفی عناصر کو صاف دیکھا جا سکتا ہے کہ انسان کا بٹوارا مذہب، ذات، نسل اور زبان کی بنیاد پر کرتے ہیں دراصل یہ وہ خطرات ہیں جو کسی بھی ملک کی بنیادیں کمزور کرنے کے لئے کافی ہیں:

"پہلی بات نے مدارس کے قیام کو ہوا دی اور دوسری نے

غیر مسلموں سے روابط کو کمزور کر دیا۔جس کے نتیجے میں معاشرتی سطح
پر تبدیلیاں شروع ہوئیں۔سب سے تکلیف دہ رجحان ذریعہ تعلیم اور
مقامی ثقافت کے تحت تھا۔مراٹھی کو ہندوؤں کی زبان کہہ کر مراٹھی
اسکولوں میں مسلم بچوں کو غیر تحریری سطح پر پڑھانا عیب قرار دے دیا
گیا۔اردو کو مسلمان کی زبان کہا گیا۔ہندوؤں کے تہوار میں شرکت
شرک ہوگی جس نے مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نظر نہ آنے
والی خلیج پیدا کرنا شروع کر دیا''۔[17]

مختصر طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رحمٰن عباس کا یہ ناول محض رومانی یا عشقیہ قصہ نہیں ہے بلکہ ناول میں عصری زندگی کے مسائل کا بھی عکس نظر آتا ہے ساتھ ہی ان حقیقتوں کا بھی اظہار نظر آتا ہے جو دھیرے دھیرے ہماری مشترکہ تہذیبی اور ثقافتی زندگی کے لیے خطرہ بنتے جا رہے ہیں۔رحمٰن عباس نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ ان تمام عناصر کو زیر بحث لانے کی کامیاب کوشش کی ہے جو ہماری قومی یکجہتی اور تہذیبی زندگی کے لیے سب سے بڑا چیلنج ہے۔

خدا کے سائے میں آنکھ مچولی

''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' رحمٰن عباس کا تیسرا ناول ہے یہ ناول 2011ء کو عرشیہ پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہوا۔اس ناول کا انتساب انہوں نے اپنے بچوں کے نام کیا ہے۔رحمٰن عباس نے موضوعاتی سطح پر ناول میں کامیاب تجربے

کیے دراصل ان کے یہاں ایک طرف روایت سے رشتہ بھی نظر آتا ہے تو دوسری طرف عصری زندگی سے بھی، ان کی گہری وابستگی ہے۔ یہ ایک ایسا ناول نگار ہے جو اپنی کہانیوں کا پلاٹ مذہب، جنس اور محبت سے تیار کرتا ہے لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ان کے یہاں مذہب اور جنس کے بغیر کچھ نہیں تو یہ سراسر ناانصافی ہوگی۔ انہوں نے بڑی باریکی سے مذہب اور جنس کے پس منظر میں اٹھنے والے تصادم کو زیر بحث لانے کی کوشش کی، کہ انھوں نے ان کی کہانیوں میں انسان کو مرکزیت حاصل ہے دراصل یہ انسان اپنے وجود کے تئیں تذبذب کا شکار ہے۔ رحمٰن عباس اس تذبذب کو عصری زندگی کے ائینے میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ زیر بحث ناول بھی انسان کی نفسیاتی اور ذہنی انتشار کی بھرپور ترجمانی کرتا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار مختلف ذہنی کیفیتوں میں مبتلا ہے دراصل وہ خدا کی ذات، کائنات، اپنی ذات، عورت اور سماجی رویوں کو لے کر تذبذب میں نظر آتا ہے، یہ کردار انسان کی دوہری زندگی پر طنز نظر آتا ہے لیکن سب سے بڑا طنز مذہب اور خدا کے وجود پر کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ان تمام رسوم و قیود کو انسانی زندگی پر تھوپے جانے کا نام دیتا ہے جو مذہب کے دائرے میں آتے ہیں۔ عبدالسلام نفسیاتی طور پر جس ہیجان کا شکار نظر آتا ہے وہ ناول میں تشکیک جیسے ماحول کو پیدا کرتا ہے ساتھ ہی خدا کے وجود پر بھی سوالیہ نشان اُٹھاتا ہے۔ یہ کردار مذہب کے نام پر ہونے والی تمام سیاست سے اختلاف کرتا نظر آتا ہے ساتھ ہی کائنات میں لوگوں کے درمیان پھیلے ہوئے انتشار کو دیکھ کر یہ خدا

کے نہ ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسجد میں ظاہری طور پر نماز پڑھتے ہوئے اس کا ذہن آمنہ کی محبت میں نظر آتا ہے۔

رحمٰن عباس کا یہ ناول پچھلے دو ناولوں سے موضوعاتی اعتبار سے مختلف نظر آتا ہے یہاں مذہب، خدا اور کائنات کے ساتھ ساتھ عورت کے وجود کو لے کر بڑا گہرا تذبذب نظر آتا ہے۔ یہ ایک نفسیاتی ناول ہے جس میں عبدالسلام کے ذریعے ان تمام واقعات کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو کہیں نہ کہیں خود مصنف کے افکار ہوتے ہیں۔ یہاں خدا کے متعلق جتنی بھی باتیں کی گئی ہیں وہ قاری کو شک اور تشکیک کے دائرے میں دھکیل سکتی ہے ساتھ ہی ایک سنجیدہ قاری ان سوالوں کے جوابات کی تلاش میں بھی صحیح منزل کو پا سکتا ہے لیکن یہ بھی سچ ہے کہ ان کے اسی انداز بیاں پر کافی لعن طعن ہوئی۔ رحمٰن عباس نے ایک طرف نفسیاتی کشمکش کو بیان کیا ہے وہیں دوسری طرف عصر حاضر کی سماجی حقیقتوں کا اظہار بھی کیا ہے یہاں خدا کو اپنی ملکیت سمجھنے والوں پر بھی گہرا طنز ہے یہی وجہ ہے کہ رحمٰن عباس خدا کے وجود کے متعلق کچھ اس طرح بات کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

''خدا سب کی ڈھال ہے اور چوری چوری چپکے چپکے سب کے ساتھ تھوڑا بہت وقت گزار لیتا ہے تو گڑیا، ایڈوانی اور مودودی کا خدا ہے، اسامہ، صدام اور ملا عمر کا خدا ہے، جارج بش اور پوتن اور ٹونی بلیئر کا خدا ہے میڈونا مادوری دکشت اور کرشمہ کپور کا خدا

ہے۔''۱۸

ناول میں جہاں رحمٰن عباس نے مختلف فلسفیانہ سوالات کھڑے کیے ہیں وہیں دوسری طرف اس ناول میں عورت کی معاشرے میں پوزیشن کو لے کر بھی سوالات نظر آتے ہیں مصنف کے نزدیک ہندوستانی معاشرے میں عورت کا وجود استحصال کے لیے پیدا ہوا ہے دراصل مرداساس معاشرہ میں عورت کا جنسی ،ذہنی ،نفسیاتی گویا ہر طرح کا استحصال ہوتا ہے۔ ناول میں مصنف نے چند عورتوں کو جو ٹیچر طبقے سے جڑی ہوئی ہیں انہیں مثال بنا کر پیش کیا ہے جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ عورتیں کس عدم اطیمنانی کا شکار ہیں لیکن المیہ اس بات کا ہے کہ باوجود اس کے عورت کا کرب کوئی نہیں سمجھتا ہے:

''وقت کی کمی کام کا بوجھ،تنخواہ سے روپے بچانے کے ایسے طریقے جن سے ساس اور نندیں اعتراض نہ کر سکیں شوہر سے اپنی فرمائشوں کی تکمیل کے آسان اور جذباتی نتیجے۔کنڈوم جائز ہے یا حرام، انگریزوں اور یہودیوں کی بنائی ہوئی ربڑ جیسی اس شے سے مزہ کم ہوتا ہے یا زیادہ وغیرہ ایسے موضوعات تھے جن پر وہ اکیلے میں خوب بحث کرتیں''۔۱۹

عورت کی بنیادی مسائل ان کی فطری خواہشات کو جس طریقے سے معاشرے میں کچلا جاتا ہے مصنف اس پر گہرا طنز کیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار

عبدالسلام عورت کے وجود سے محبت کرتا ہے اس نے ان تمام محبوباؤں کا ذکر ان ڈائریوں میں کیا ہے جن کو وہ شائع کرنا چاہتا ہے لیکن یہاں بھی ناول کے مرکزی کردار ان ڈائریوں میں اس عورت کا ذکر کرنا بھول جاتا ہے جس سے وہ سب سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ رحمٰن عباس نے اس ناول کے ذریعے کئی فلسفیانہ سوال اُٹھائے ہیں لیکن اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ عبدالسلام کے کردار میں خود مصنف اپنے خیالات کی تشہیر کرتا ہے جن پر لب کشائی ممنوعہ ہے لیکن عبدالسلام برصغیر کے کلیشے کے خلاف آواز بلند کرتا ہے ، یہ آواز احتجاجی اور باغیانہ ہوتی ہے ساتھ ہی اس احتجاجی اواز میں جستجو کی کئی کڑیاں بھی شامل ہیں زندگی کیا ہے؟ سے لے کر خدا کی اصلیت تک عبدالسلام جو کچھ کہہ دیتا ہے وہ اس کی گمراہی نہیں بلکہ چیزوں کو مزید اچھے سے جاننے کی کوشش بھی ہے اور یہ کوشش تب بھی عملی روپ دھارن نہیں کرسکتی جب تک نہ سوال کی کیفیت پیدا ہو وہ سوال خدا کی ذات سے متعلق ہو، کائنات سے متعلق ہو، خود کی ذات سے ہو یا پھر ان تمام فلسفیوں پر بھی جن پر سوال کرنا مناسب نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن زیر بحث ناول میں عبدالسلام ہر شے پر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے علامہ اقبال کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''بیٹا اقبال صاحب بے قومی کی باتیں زیادہ کیا کرتے تھے
جتنے بڑے علامہ وہ کہلاتے ہیں اس کے تین مبالغہ ان کی پہچان ہے
۔اردو شاعری سے مبالغہ کی لعنت کو نکال دیا جائے تو صرف غازہ

،گیسواور غمزہ بچ جائے گا۔''۲۰؎

ناول انسان کی ظاہری اور باطنی کیفیتوں کا برملا اظہار کرتا ہے عبدالسلام کے کردار کے ذریعے اس تمام کشمکش کو صاف دیکھا جا سکتا ہے یہ کردار معاشرے میں نابرابری، استحصال اور مذہب کے ظاہری پن سے بیزار نظر آتا ہے ساتھ ہی مصنف بدلتی ہوئی زندگی کا بھی المیہ پیش کرتا ہے یہاں مشینوں کے ذریعے جو تہذیبی زندگی میں بدلاؤ آرہا ہے مصنف اس کے حق میں نظر نہیں آتے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ بدلاؤ شعور کے سبب ہونا چاہیے رحمٰن عباس کا کمال یہ ہے کہ وہ اپنے ہر ناول میں استحصال، عدم مساوات اور دیگر گوناگوں مسائل پر طنز کرتے ہیں ان کے نزدیک حق تلفی اور استحصال انسان کو شعوری اذیت پہنچاتا ہے جس کے صدمے سے باہر نکلنا مشکل ہو جاتا ہے انہوں نے اس اذیت اور عدم مساوات پر گہری چوٹ کی ہے:

''صدیوں کے استحصال اور عدم مساوات نے اس آدی واسی کی زندگی میں جس ابدی تنہائی اور سکوت کو جنم دیا تھا آج پہلی بار اس میں ایک پل کے لیے ایسی حرکت ہوئی کسی نے انسان سمجھ کر کسی چیز کا تقاضہ کیا تھا ورنہ اعلی ذات کے افراد ان کے گھروں برتنوں یہاں تک کہ ان کے سائیوں سے بھی دور رہتے تھے۔''۲۱؎

دراصل ناول کے مرکزی کردار کو خدا کے وجود سے کافی شکایت نظر آتی ہے

یہ شکایت معاشرے کے بے نظامی کے سبب نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ وہ پورے ناول میں خدا کی نفی دیکھنے کو ملتی ہے، یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ رحمٰن عباس کو اس طرح کے موضوعات پر گفتگو کرنے پر کافی ملامت کا نشانہ بنایا گیا:

''عبدالسلام نے آسمان کی طرف دیکھا اور کہا: کس قدر پاگل پن ہے یار؟ کنٹرول نہیں کر سکتا کیا؟ لیکن فوراً سے نطشے کا جملہ یاد آیا کہ خدا نے ننانوے فی صد احمق اسی لیے پیدا کیے ہیں تاکہ اس کی حکمرانی برقرار رہے۔ اس کے معتقد اکثریت میں رہیں''۔۲۲

ناول میں عبدالسلام اس لئے بھی خدا اور مذہب سے بیزار نظر آتے ہیں کہ چند ٹھیکداروں نے اسے ذاتی ملکیت سمجھ رکھا ہے اور ہر دور میں اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا ہے:

''مجھے معلوم نہیں تھا کہ مذہبی کتابیں پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ دوسروں کو پڑھنے کا مشورہ دینے کے لیے ہیں مذہب عمل کرنے کے لیے نہیں بلکہ شخصیت کو سنوارنے سماج میں مرتبہ اور سیاسی مقاصد حاصل کرنے کا ایک شارٹ کٹ ہے۔ مذہب لاٹھی ہے ۔دولتمند افراد کا ایک بڑا طبقہ مذہب کو ایک نشہ آور گولی کی طرح استعمال کرتا ہے۔ بے ایمان، مفاد پرست، شخصیت پرست ،دھوکے باز اور بد اخلاق افراد بھی مذہب کی چادر اوڑھ کر اپنے سیاہ باطن اور ناسور زدہ

ذہنیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔'' ۲۳

یہ ناول کردار نگاری اور منظر نگاری کے اعتبار سے اہم ناول ہے۔ناول میں عبدالسلام کا کردار ،مرکزی کردار کی حیثیت رکھتا ہے دراصل ناول کے کردار جتنے جاندار ہوں گے ناول اتنا ہی کامیاب بھی ہوگا۔کردار نگاری ناول کا ایک اہم جز مانا جاتا ہے دراصل قصہ کرداروں کے ذریعے ہی پائے تکمیل کو پہنچتا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ کامیاب ناول کا منحصر اس کی کردار نگاری پر ہوتا ہے اور وہی ناول مقبول ہوتے ہیں جن کے کردار جاندار ہوتے ہیں۔عتیق احمد کردار نگاری کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں:

'' میں ناول کو انسانی کردار کی مصوری سمجھتا ہوں۔انسان کے کردار پر روشنی ڈالنا اور اس کے اسرار کھولنا ہی ناول کا بنیادی مقصد ہے۔'' ۲۴

زیر بحث ناول کردار نگاری کے اعتبار سے عمدہ ناول ہے جس میں عبدالسلام کا کرادر مرکزی حیثیت کا حامل ہے یہ ایک ایسا کردار ہے جو مذہب،خدا اور کائنات پر مسلسل سوال کرتا رہتا ہے۔اس کردار میں تذبذب نظر آتا ہے لیکن وہیں یہ مشکوک بھرے سوالات قاری کے یہاں غور وفکر کو جنم دیتے ہیں۔کردار نگاری کے ساتھ ساتھ یہ ناول منظر نگاری کے بھی بہترین مرقع پیش کرتا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں رحمٰن عباس کے ناول جس بھی منظر کا نقشہ کھینچتے ہیں اس کی ہو بہو تصویر ہمارے

سامنے آتی ہے:

''عبدالسلام چار بنگلہ (اندھیری ممبئی) میں سات منزلہ عمارت میں رہتا تھا۔اس کا فلیٹ گراؤنڈ فلور پر تھا۔فلیٹ میں داخل ہوں تو سامنے الماری میں قرآن مجید کی پانچ کاپیاں (دو انگریزی تراجم دو اردو تراجم اور ایک عربی زبان میں) تبلیغی نصاب کی اردو ہندی جلدیں ،بہشتی زیور اور تاریخی انبیاء مختصر شافعی فقہ کی تین جلدیں،مسنون دعائیں، جماعت اسلامی کے امیر مولانا مودودی کی کتابیں، خلافت و ملوکیت اور پردہ کے ساتھ ساتھ چند اور مقبول مذہبی کتابیں تھیں۔فرش پر ایرانی قالین بچھا ہوا رہتا۔ایک عمدہ صوفہ تھا۔دیوار پر سونی کا فلیٹ ٹی وی جس کے نیچے ہونیڈا کمپنی کا ڈی وی ڈی پلیر۔ڈی وی ڈی پلیر پر ہندوستانی گل بوٹوں کی چاپ والا پردہ پڑا رہتا۔دیوار پر ایک اسلامی کلینڈر ایک زرد رنگ گھڑی۔دوسری دیوار پر ایک بڑی سی فریم تھی جس میں مخمل کے کپڑے پر قرآنی آیات خطاطی کا عمدہ نمونہ تھیں۔فرش پر دیدہ زیب ٹائلز لگی ہوئی تھیں۔''[۲۵]

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول عبدالسلام کے گرد طواف کرتا ہوا نظر آتا ہے دراصل مصنف نے اس کردار کے ذریعے بہت سارے فلسفیانہ سوالات اُٹھائے

ہیں ساتھ ہی ان سوالوں کے پس منظر میں انسان کی اس ذہنی کیفیت کو بھی اجاگر کیا ہے جو عصر حاضر میں تذبذب کا شکار ہے مذہب کا ظاہری پن اور عدم مساوات کے سبب نئی نسل کا انسان جس جنسی اذیت کا شکار ہے اس کی عمدہ مثال عبدالسلام کے کردار میں نظر آتی ہے۔ ناول میں اس بات کی طرف بھی توجہ دلانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کس طرح عصر حاضر میں نئی نسل مذہب سے دور بھاگتا ہوا نظر آتا ہے جس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ مذہب کو ہتھیار بنا کر سادہ لوح اور دبے کچلے انسانوں کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے اور جو کوئی اس جابرانہ رویے پر سوال اٹھاتا ہے اسے مذہب کے دائرے سے باہر نکال دیا جاتا ہے ناول مجموعی طور پر اسی انتہا پسندی پر گہرا طنز ہے:

> ''مذہب کی چادر میں لپٹے ہوئے افراد جو اس کے اطراف پھیلے ہوئے تھے اور دو وقت دین دھرم کا پرچار کیا کرتے تھے وہ فی نفس جابروں، مفسدوں اور امیروں کے طرفدار تھے۔''۲٦

روحزن

اکیسویں صدی میں اُردو ادب بالخصوص اُردو ناول کے میدان میں کچھ ایسے فن پارے وجود میں آئے جو ایک طرف مصنف کی شہرت کا سبب بنا تو وہیں دوسری طرف سماج میں ان فن پاروں کو متنازعہ قرار دیا گیا۔ دراصل یہ فن پارے سماج کے ان پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں جن کو شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے اور اس شجر ممنوعہ

پرلب کشائی کرنے والوں میں عصر حاضر کے ایک اہم ناول نگار رحمٰن عباس کا نام بھی شامل ہے ۔رحمٰن عباس ایک ایسا ناول نگار ہے جس کے ناولوں پر اعتراضات ہوتے رہے ہیں خواہ بات ان کے ناول 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' ہو یا ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی کی ،لیکن باوجوداس کے رحمٰن عباس کا قلم نہیں ٹھہرا وہ بغیر کسی ڈر کے مسلسل لکھتے رہے بیگ احساس کے مطابق اگر رحمٰن عباس کے علاوہ کوئی کمزور اعصاب والا ادیب ہوتا تو لکھنا چھوڑ دیتا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ردوقبول کی پرواہ کیے بغیر ''روحزن'' جیسا ناول تخلیق کیا دراصل ''روحزن'' رحمٰن عباس کی اختراع کی ہوئی اصطلاح ہے جس کے متعلق وہ ناول کے اختتام پر یوں لکھتے ہیں:

> ''روح اور حزن کی آواز نیز ان لفظوں کے معنی 'لفظ' روحزن'' کی تشکیل کے وقت میرے ذہن میں تھے لیکن اس لفظ کو روح اور حزن کا مرکب نہ سمجھا جائے۔ روحزن، بہ طور سالم لفظ ایک ذہنی ، جذباتی اور نفسیاتی صورت حال کو پیش کرتا ہے ناول اُس کیفیت کی پیش کش کے ساتھ ایک نئے لفظ کو صورت عطا کرنے کی کوشش ہے۔'' ۲۷

رحمٰن عباس کا یہ ناول فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور ناول کا آغاز بھی ناول کے مرکزی کردار اسرار اور حنا کی زندگی کے آخری دن سے ہوتا ہے ناول کا پہلا جملہ ''اسرار اور حنا کی زندگی کا وہ آخری دن تھا۔'' ناول کے پہلے جملے سے ہی

مایوسی کی کیفیت قاری پر طاری ہوجاتی ہے اور یہ جملہ قاری کے اندر اسرار اور حنا کے متعلق جاننے کی تجسس پیدا کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ناول کی پرت در پرت کھلنی شروع ہوجاتی ہے ۔ناول ’روحزن‘ کو مصنف نے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کا آغاز اردو کے مشہور شاعر بانی کے شعر کے مصرعہ سے ہوتا ہے۔اسرار اپنے والد کی موت کے بعد ممبئی آتا ہے اور یہیں جماعت کی کھولی میں گاؤں کے دیگر افراد کے ساتھ رہنے لگتا ہے ۔اسرار یہاں اپنے گاؤں کے دوستوں کے ساتھ ممبئی دیکھتا ہے ممبئی کی کوکھ میں پنپنے اور اُبھرنے والے ہر واقعے کو دیکھتا ہے۔ ممبئی آنے سے پہلے اسرار اپنے والدین کے ساتھ مابعد مورفو میں رہتا تھا جہاں اس کا والد ملک دیشمکھ اپنے دوستوں ساجد سولکر اور عابد سولکر کے ساتھ مچھلیاں شکار کرتا تھا ان کی کشتی کا نام ’سمندر کی رانی‘ تھا ایک دن سمندر کی لہروں نے ان کی کشتی کو اپنی آغوش میں لے لیا اور ساحل پر صرف عابد سولکر ہی پہنچا۔ والد کے انتقال کے بعد ان کی والدہ حسینہ دیشمکھ نے سوکھی مچھلیاں بیچ کر اسرار کو لکھایا پڑھایا اور جب اسرار نے دسویں جماعت کا امتحان دیا تو اُسی شام اس نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ اپنے دوستوں کے ساتھ ممبئی جانا چاہتا ہے ماں نے کافی منع کیا لیکن آخر میں اسرار کو ممبئی جانے کی اجازت دے دی۔ اسرار رتنا گری سے ٹرین میں اپنے دوستوں سلیمان ونو اور قاسم دلوی کے ساتھ بیٹھ گیا اور ٹرین ممبئی کی طرف چل پڑی ساڑھے سات گھنٹوں کی مسافت کے بعد جب اسرار ممبئی پہنچا تو اسٹیشن پر

رات کے وقت بھی اتنی بھیڑ کو دیکھ کر حیران ہوا ممبئ میں یکم مئی کو اسرار کا پہلا دن تھا اور یکم مئی ہی یوم مہاراشٹر تھا۔جس کھولی میں اسرار سونے کے لئے گیا اس میں کل ۱۴/افراد تھے صبح اذان کی آواز سن کر اسرار جاگ اُٹھتا ہے لیکن دوبارہ سوجاتا ہے اسے خواب آتا ہے اور خواب میں اسے ہرایک چیز کالی دکھائی دیتی ہے اور ایک دیوی کا درشن ہوتا ہے جو اپنا نام ''ممبا دیوی'' بتاتی ہے اور اس نے اسرار کو بتایا کہ یہاں کی خوبصورتی کو صرف یہاں کا رہنے والا ہی دیکھ سکتا ہے۔جب اسرار کی آنکھ دوبارہ کھلی اُس نے دیکھا کہ دھوپ کھلی ہوئی ہے اور اس کے دوست نے اسے جلدی سے تیار ہونے کے لئے کہا اور ساتھ ہی دوسرے دوست قاسم دلوی نے کہا کہ یہاں سنڈاس کے لئے بھی لائن لگانی پڑتی ہے اسرار بغیر کچھ کہے سنڈاس کی طرف چل پڑا ہے سنڈاس کی حالت دیکھ کر اسے حیرانی ہوتی ہے دیواروں پر عریاں بنائی ہوئی تصویریں جن سے شہوت ٹپک رہی تھی دوسری طرف اس نے ایک شعر لکھا ہوا دیکھا۔

اس انجمن میں آپ کو آنا ہے بار بار
دیوار و در کو غور سے پہچان لیجئے

سنڈاس کی دیواروں پر فحش اور عریاں ڈرائینگ بنائی ہوئی تھیں انہیں دیکھ کر اسرار خیالوں کی دُنیا میں ڈوب جاتا ہے اور اسے مس جمیلہ یاد آتی ہے جو اس کی اسکول ٹیچر تھی اور ایک شام جب اس نے مس جمیلہ کے گھر جا کر اس کے ساتھ صحبت

کی تھی وہ تمام منظر اسے یاد آیا اسے یاد آیا کس طرح مس جمیلہ اپنے آپ کو قابو میں نہیں رکھ پائی تھی یہ کہہ کر خواہشات کا کوئی مذہب نہیں ہوتا اسے اپنی آغوش میں لے لیا تھا۔

''خواہش کا کوئی موسم نہیں ہوتا۔خواہش بیدار ہوتو وہ اونچی سے اونچی دیوار عبور کرسکتی ہے ۔خواہش آدم کی مٹی کا کلیدی عنصر ہے۔خواہش کی تسکین کا یا کلپ کرتی ہے۔''۲۸

اسرار سنڈ اس سے باہر آیا تو اس کے ذہن میں گاؤں کی ساری یادیں گردش کررہی تھیں کچھ وقت کے بعد سبھی دوست ممبئی گھومنے نکل جاتے ہیں۔اسرار کے ساتھ دولڑکے پہلی بار ممبئی آئے تھے یہ ان سب کے لئے یادگار لمحہ تھا یہ سبھی سلیم گھارے اور محمد علی کے ساتھ ممبئی گھومنے نکلے ۔انہوں نے ممبئی کے بہت سارے تاریخی مقامات کی سیر کی محمد علی نے انہیں گیٹ وے آف انڈیا کی تاریخ بتائی ساتھ ہی سمندر کی بھی سیر کرائی ،سمندر کو دیکھتے ہی اسرار کو پھر سے مس جمیلہ یاد آئی اسے یاد آتا ہے کہ کس طرح اس نے کشتی میں سمندر کے بیچ مس جمیلہ کو گلے لگایا تھا۔ سمندر کی سیر کے بعد یہ لوگ کھولی کی طرف آتے ہیں راستے میں اسرار محمد علی سے اس کے کاروبار اور ملازمت کے بارے میں پوچھتا ہے اس پر محمد علی کہتا ہے کہ اس کا سیٹھ بہت بڑا تاجر ہے اور نکلی ہیروں کا بیوپاری ہے ۔دراصل اس کے سیٹھ کو نقلی ہیروں کی اور اصلی ہیروں کا اچھے سے علم ہے اور عام انسان کو یہ معلوم نہیں ہوتا

ہے۔ دوسرے روز سبھی عثمان حیدر کے ساتھ کتابیں خریدنے جاتے ہیں اور اسرار فٹ پاتھ پر بیٹھے لوگوں کو دیکھتا رہتا ہے۔ کتابوں کی فروخت کے بعد اسرار دوستوں کے ساتھ چور بازار جاتا ہے جہاں ایک صوفی آدمی اسرار کا ہاتھ پکڑ کر حیران ہوجاتا ہے اور ایک عمر دراز شخص بھی اسرار کا ہاتھ دیکھ کر کہتا ہے کہ سب خدا کے ہاتھ میں ہے یہ ساری باتیں عثمان سن کر ہنس دیتا ہے اور اسرار سے کہتا ہے کہ یہاں لوگوں کو بیوقوف بنایا جاتا ہے وہاں سے نکلنے کے بعد یہ لوگ واپس کھولی میں آجاتے ہیں۔شام کی چائے کے بعد محمد علی اسرار کو ملازمت کی خوشی میں پارٹی دینے کی غرض سے ٹیکسی میں بیٹھا دیتا ہے ٹیکسی میں بیٹھتے وقت بھی مس جمیلہ کی یاد اسرار کو آتی رہتی ہے محمد علی اسرار کو کہنی مار کر خیالوں کی دُنیا سے واپس لاتا ہے اور ایک ایسی جگہ لے جاتا ہے جسے کماٹی پورہ کہتے ہیں یا جسے جنت کہتے ہیں گلیوں سے گزرتے ہوئے اسرار کو اس بات کا علم ہوا کہ یہ سبھی عورتیں دھندا کرتی ہیں محمد علی کی جان پہچان مادھوری نامی طوائف سے ہوتی ہے جو اسرار کو شانتی کے ساتھ بھیج دیتی ہے۔ دو مہینے کی تنخواہ ملنے کے بعد اسرار گاؤں چلا جاتا ہے۔ جانے سے پہلے ممبا دیوی کے مندر کو دیکھ کر اسے ویرا دیوی کا مندر یاد آتا ہے یہ وہی مندر ہے جس کے ارد گرد ۲۰۰۳ء میں دھماکہ ہوا تھا اور بہت سارے لوگ مر گئے تھے شام کو ٹرین میں بیٹھنے کے بعد اسے شانتی خواب میں آتی ہے اس کے بعد یہ ایک ایسا خواب دیکھتا ہے جس میں وہ ایک عورت کے ساتھ مجامت کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے دل پر گھاؤ ہوتا ہے

۔لیکن یہ خواب یہ کسی سے نہیں کہہ پاتا ہے۔گاؤں پہنچ کر اپنی ماں سے ملتا ہے گاؤں کے لوگوں سے ملتا ہے اور مس جمیلہ کے ساتھ بھی رات گزارتا ہے اس کے بعد اسرار محمد علی کے گھر جاتا ہے جہاں وہ محمد علی کی ماں سے ملتا ہے لیکن اصل میں یہ محمد علی کی والد کی دوسری بیوی ہوتی ہے جس کا نام ریحانہ ہے۔ ریحانہ نے ہی محمد علی کی اصلی ماں رشیدہ کے بارے میں بھی چند باتیں بتادیں اسرار کو یہ باتیں سن کر حیرت ہوئی اوراس کے دماغ میں طرح طرح کے سوالات نے جنم لیا کہ آخر انسان بے وفائی کیوں کرتا ہے ۔لیکن مس جمیلہ کے گھر پہنچ کر اسے احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی بے وفائی میں برابر کا شریک ہے ۔۔ کچھ دنوں بعد اسرار واپس ممبئی جاتا ہے ۔ایک دن بارش ہورہی تھی اسرار شام کے وقت کماٹی پورہ کی طرف نکلا تاکہ شانتی کے ساتھ مل آئے اور اسے وہ خواب بھی بتادے جو اس نے اُس کے متعلق دیکھا تھا گھر سے نکلنے کے بعد اسرار بابا حاجی علی درگاہ روڈ پر تھا اس جگہ بھکاری کم تھے اور سمندر کا پانی بھی اترا ہوا تھا اسرار درگاہ میں بیٹھ گیا اچانک اس کی نظر ایک خوبصورت لڑکی پر پڑی جو بالکل اکیلی تھی۔ اسرار اس کی طرف چل پڑا اور اسے دیکھ کر اسرار کے دل میں عجیب سی الہامی کیفیت پیدا ہوگئی۔ اجنبی لڑکی بارش میں بھیگ چکی تھی تھوڑی دیر کے بعد یہ اجنبی لڑکی اپنا نام حنا بتاتی ہے۔اس کے بعد اسرار سے حنا نے کہا کہ وہ ہر سنیچر کو درگاہ پر آتی ہے ٹیکسی میں بیٹھنے کے بعد اسرار پر عجیب سی کیفیت طاری تھی اس کے بعد اسرار شانتی کے پاس پہنچ گیا جہاں شانتی نے بتایا کہ کس طرح اُس کے گاؤں میں

تباہی مچی تھی اوراس کے اشوک ماما نے اسے شہر لایا اُسے لگتا تھا کہ وہ اُس کے ساتھ شادی کرے گا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کا جنسی استحصال کر کے کر کے اسے یوں ہی چھوڑ دیا۔ اسرار شانتی سے اپنے اُس خواب کا ذکر کرتا ہے جس میں وہ ایک ایسی عورت کے ساتھ مباشرت کرتا ہے جواس کی اپنی ہے اوراس سے اس کا ذہن کشمکش میں رہتا ہے شانتی بھی اسی طرح کے خواب کا ذکر کرتی ہے کہ وہ بھی خواب میں اپنے باپ کے ساتھ مباشرت کرتی ہے اس کے بعد شانتی کہتی ہے کہ یہ خواب دراصل اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے اپنوں نے ہماری روح کو نقصان پہنچایا ہے۔

> ''شانتی کو سماجی خدمات گار نے بتایا تھا کہ سپنے میں اپنے سب سے قریبی رشتے دار کے ساتھ مباشرت اس بات کی علامت ہے کہ ہمارے دل اور روح کو ہمارے سب سے قریبی لوگوں نے تکلیف پہنچائی ہے لیکن ہم نے انہیں معاف کردیا ہے ہمیں ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔''۲۹

واپس آنے کے بعد اسرار محمد علی کو بتاتا ہے کہ وہ شانتی کے پاس گیا تھا۔ آج بستر پر لیٹتے ہی حنا کے خیالوں نے اسرار کو اپنی آغوش میں لے لیا اور اسرار کو نیند آ گئی اسے بے صبری سے سنیچر کا انتظار رہتا ہے سنیچر کو یہ محمد علی کو بتاتا ہے کہ وہ درگاہ جانا چاہتا ہے محمد علی اسرار سے کہتا ہے کہ سیٹھ کو بھی بابا پر بڑا یقین ہے اور جب بابری مسجد کا انہدام ہوا تھا تو کس طرح واگھ مارے نے اسے رمیش کہہ کر بچایا تھا۔ اسرار

سنیچر کو حنا سے درگاہ میں ملتا ہے اور دونوں ڈھیر ساری باتیں کرتے ہیں دونوں کی یہ دوسری ہی ملاقات تھی لیکن دونوں کھل کر باتیں کرر ہے تھے۔ حنا کے والد کا نام یوسف میمن تھا جس کی عطر کی دُکان تھی جو اسے اپنے ایک دوست کی وجہ سے ملی تھی۔ ایک دن عرب سے بورا شد نامی کاروباری آتا ہے جو یوسف میمن سے ہر سال دو سے تین لاکھ تک کی عطر خریدنے کی بات کرتا ہے دونوں میں اچھی واقفیت ہو جاتی ہے ایک مہینے کے بعد بورا شد اپنی بیوی ایمل جو کہ بیورو کریٹ ہوتی ہے اور لڑکی وردالسعادۃ کے ساتھ ممبئی آتا ہے یوسف ان کے لئے ایک بنگلے کا بھی انتظام کرتا ہے اور گھر پر کھانے کی بھی دعوت دیتا ہے کچھ دنوں بعد بورا شد دہلی جاتا ہے اور یوسف اور ایمل بازار جانے لگتے ہیں دونوں میں بات چیت بڑھتی ہے ایک شام ایمل یوسف کو لکم کیم کھلا دیتی ہے جس سے یوسف پر نشہ طاری ہوتا ہے اور دونوں ایک دوسرے میں کھوہ جاتے ہیں اس طرح یوسف اور ایمل میں جسمانی تعلقات قائم ہونے شروع ہو جاتے ہیں کچھ دنوں کے بعد ایمل کے بنگلے پر ایک پارٹی کا اہتمام کیا جاتا ہے جہاں صرف ہم عقیدہ لوگوں کو دعوت دی جاتی ہے اس پارٹی میں یوسف بھی شریک ہوتا ہے۔ پارٹی کے بعد جب یوسف گھر لوٹتا ہے تو اس کے اندر ایک نفسیاتی ہیجان پیدا ہوتا ہے وہ خود سے سوال کرتا ہے کہ میں کون ہوں؟ کیا مجھے اس طرح گھر والے قبول کریں گے وغیرہ وغیرہ رات کو بستر پر لیٹتے وقت اس کی بیوی درخشاں نے یوسف کی کمر کو دوسری طرف موڑ کر دیکھا پہلے مہینے میں اپنی بیوی کے

ساتھ محبت کر لیتا تھا لیکن اب اسے اپنی بیوی کی ضرورت محسوس نہیں ہورہی تھی درخشاں کو لگا شاید مصروفیات کی وجہ سے ایسا ہورہا ہے لیکن آج یوسف کو اپنی بیوی بدبودار کیڑا محسوس ہورہی تھی اوراُسے ندامت ہورہی تھی کہ آج تک اس نے کس طرح اس کے ساتھ زندگی گزاری ہے۔

''دوسری طرف یوسف نے اندازہ لگایا کہ بستر پر جو بدہیت
اور بدبودار کیڑا لیٹا ہوا ہے وہ اُس کی طرف دیکھ رہا ہے۔کیا پہلے اُس
کے حواس بیدار نہیں تھے۔'' ۳۰

تھوڑے عرصے کے بعد یوسف درخشاں سے الگ رہنے کا فیصلہ کر لیتا ہے علیحدگی کے بعد بھی یوسف گھر کے اخراجات پورے کرتا ہے اور درخشاں بابا کی درگاہ کے باہر ایک صوفی سے تعویذ وغیرہ لاتی رہتی ہے تاکہ یوسف پھر لوٹ آئے کچھ وقت بعد حنا اپنے والد کے خیالات سے آشنا ہوکر حیرت میں پڑ جاتی ہے۔ یوسف پہلے کی طرح نہیں بلکہ بالکل مختلف انداز سے اپنی بیٹی کے ساتھ کسی بھی موضوع پر کھل کر بات کرر ہا تھا۔ کچھ عرصے بعد یوسف نے کالج میں حنا کا داخلہ کرایا جہاں اس کی ملاقات ودی سے ہوتی ہے جوانگریزی میں شاعری کرتی ہے ایک روز ودی کو حنا اپنے والد سے ملاتی ہے کچھ وقت کے بعد ایمل اوراس کی بیٹی سے یوسف حنا کو ملاتا ہے جہاں وردالسعادۃ حنا کا ہاتھ دیکھ کر یہ کہتی ہے کہ اُسے ایک لڑکا ملے گا جب دن دن نہ ہوگا اور رات رات نہیں لیکن ہوا، پانی اور بارش کو یہ لمحہ اچھا نہیں لگے گا

اس سے پہلے وردالسعادۃ اور کچھ کہتی گھر والے لوٹ آتے ہیں یہ سن کر حنا پریشان بھی ہوتی ہے اور مسکراتی بھی ہے۔ حنا جس کالج میں پڑھتی ہے اس میں مس تھامس پرنسپل ہوتی ہے اور جس کے جسمانی تعلقات یوسف کے ساتھ ہوتے ہیں دراصل مس تھامس یوسف کو پونہ کی پارٹی میں ملی ہوتی ہے۔ مس تھامس کے بارے میں جب حنا سنتی ہے کہ اس کے باپ کی جان پہچان ہے وہ ایک طرف حیران بھی ہوتی ہے اور خوش بھی۔ حنا اپنی ساری باتیں ودی کو بتاتی ہے اور یہ بھی بتاتی ہے کہ اسے اسرار سے محبت ہوگئی ہے۔ اور یہ بھی بتاتی ہے کہ وردالسعادۃ نے یہ پیشن گوئی بھی کی ہے یہ سن کر ودی اسے بتاتی ہے کہ یہ بیہودہ باتیں ہیں ان میں کوئی اصلیت نہیں ہے گھر جانے سے پہلے ودی اور حنا ۱۰۰ روپے کا نوٹ ایک لڑکی کو اس وعدے کے ساتھ دیتے ہیں کہ وہ اپنی پوری کہانی بتادے گی یہ لڑکی اصل میں بھیک مانگتی ہے لڑکی ان دونوں کو بہت کچھ سناتی ہے۔ اور آخر میں ایک ایسی بات کا ذکر کرتی ہے کہ دونوں کی روح لرز جاتی ہے وہ بتاتی ہے کہ اس کی ماں کسی اور کے ساتھ جسمانی تعلقات میں مبتلا ہے اور اس کا باپ اس کے ساتھ کافی وقت سے جنسی استحصال کررہاہے اور پہلی بار اس کے باپ نے اسے افیم دے کر جنسی استحصال کیا تھا یہ سن کر دونوں کی آنکھیں نم ہوتی ہیں۔ گھر کے اندر جانے سے پہلے حنا کو سیڑھیوں سے بابا کی درگاہ پر باہر بیٹھنے والے پیر ملتے ہیں جن پر اب ان کی ماں کو یقین ہوگیا تھا اندر پہنچ کر صوفے پر بھی حنا پیر کی مہک کو محسوس کرتی ہے اچانک اس کی آنکھ لگ

جاتی ہے اور ڈراؤنا خواب دیکھ کر جاگ جاتی ہے کچھ عرصے بعد حنا کی ملاقات اسرار سے ہوئی اس ملاقات میں اسرار پہلا بوسہ حنا کو دیتا ہے گھر لوٹنے کے بعد حنا گھر میں اپنے باپ کو دیکھتی ہے جو اس لئے آیا ہوتا ہے کیوں کہ اُسے امریکہ جانا ہوتا ہے ۔پچھلے دس مہینوں سے اسرار اور حنا کئی بار مل چکے تھے ۔ان دنوں ممبئ میں کافی بارش ہو رہی تھی کچھ دن بعد محمد علی ، ودی اور اسرار حنا کے گھر چلے جاتے ہیں کھانا کھانے کے بعد وری حنا سے کہتی ہے کہ وہ اسرار کے ساتھ جسمانی تعلقات قائم کر لے اور جب دوبارہ حنا اسرار کے ساتھ ملتی ہے لیکن اپنے جذبے کا اظہار کسی بھی صورت نہیں کر پاتی شام کو بستر پر لیٹے لیٹے وہ اسرار کو فون کر کے اپنی دن کی ساری کیفیت سے آشنا کراتی ہے دونوں میں ملنے کے لئے تڑپ پیدا ہوتی ہے دونوں دوسری صبح کو ملنے نکل جاتے ہیں لیکن آج ایسا لگ رہا تھا کہ کئی دنوں سے بارش نہیں ہو رہی ہے لیکن کچھ دنوں سے بارش لگا تار برس رہی تھی جس وجہ سے ممبئ کے اطراف پھیلا ہوا سمندر طیش میں تھا ہر طرف کہرام مچا ہوا تھا بیشتر علاقوں میں بجلی نہیں تھی ۔اسرار اور حنا ایک بڑے پتھر پر بیٹھ گئے اور پھر پتھر سے نیچے اتر کر دونوں نے پتھروں کے درمیان ایک دوسرے کو گلے لگایا دونوں محبت میں مست ہو چکے تھے کہ اچانک پانی کے زور کے تھپیڑے نے دونوں کو آغوش میں لے کے ہمیشہ کی نیند میں سلا دیا۔

”سمندر کی اس سرکشی اور وحشت سے بے پرواہ اسرار اور حنا
وجود کی لطافت کو محسوس کر کے نفس کے غائب حاضر غائب لمحے میں

داخل ہوئے ہی تھے کہ ایک سرکش موج نے طیش میں اپنا سر اُس پتھر
پر مارا جس پر وہ دونوں ایک دوسرے میں گم ہو چکے تھے۔ جب موج
نے اسرار کو کھینچا عین اُسی وقت اسرار وجود کی لطافت کی ارتقائی سطح
پر پہنچ کر اس مختصر لمحے میں نابینا ہو گیا تھا اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔
موج نے دوسرا حملہ کیا۔ حنا نے دونوں ہاتھوں سے اُس کے پیروں کو
پکڑا ۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پکڑا لیکن اس
سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتے شیطانی موج نے انہیں گرفت میں لے
لیا۔''[۱۳۱]

زیر بحث ناول ''روحزن'' رحمٰن عباس کا ایک ایسا ناول ہے۔ جو اپنے اندر معنی کی گہرائی رکھتا ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی ذہنی، جنسی اور جذباتی کشمکش نے ایک ایسی صورت اختیار کی ہوئی ہے جس سے عصر حاضر کا انسان شعور اور لاشعور میں پنپنے والے کرب کو جھیل رہا ہے ۔ ناول میں ممبئی کی سماجی زندگی کو بحث کا موضوع بنایا گیا ہے اور ناول کے تمام کردار اس زندگی کا حصہ ہیں جس میں ذہنی، جذباتی، نفسیاتی اور جنسی کشمکش عروج پر ہے۔ ناول کا مرکز ممبئی اور مرکزی کردار اسرار کے اطراف مصنف نے زیادہ تر جنس کو دکھایا ہے ۔ اسرار اور حنا کے علاوہ جتنے بھی کردار اور ان کرداروں کے متعلق جتنے واقعات اُبھر کر آتے ہیں ہر واقعہ کسی نہ کسی طرح جنس سے جڑا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن ہر واقعے میں جنس کی نوعیت بدلتی ہوئی دکھائی دیتی

ہے۔اسرار جس کا تعلق ایک گاؤں سے ہے جہاں وہ مس جمیلہ کے ساتھ جنسی رشتہ قائم کرتا ہے ۔اس کے بعد اسرار شانتی اور حنا کے ساتھ بھی یہ تعلقات قائم کرتا ہے لیکن تینوں مقامات پر اس جنس کی نوعیت مختلف دکھائی دیتی ہے ۔ایک طرف مس جمیلہ ہے جو تشنگی اور ہوس لئے ہوئے اسرار کو اپنی آغوش میں ہمیشہ رکھنا چاہتی ہے تو وہیں شانتی ایک ایسی طوائف ہے جو اپنے اندر درمند دل اور محبت رکھے ہوئے ہے وہ اسرار کو اپنے اوپر گزرے ہوئے ہر واقعے کی تفصیل بتاتی ہے کہ کس طرح اُس کے گاؤں لاتور میں تباہی مچی تھی اُس کے گھر کے سبھی افراد مر گئے اور پھر اس کے ماما نے اسے اپنے ساتھ پونہ لے آیا اور جہاں اس کے ساتھ وہ جنسی استحصال کرتا رہا اور پھر چھوڑ کر چلا گیا۔شانتی کے علاوہ حنا بھی ایک ایسا کردار ہے جو محبت کا پیکر ہے جو زندگی کے آخری لمحات میں بھی اسرار کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا ہوتا ہے اور ان آنکھوں میں سوائے عشق کے کچھ نہیں ہوتا ہے۔

> ''دوبار سمندر نے اُنھیں اوپر اچھالا صرف یہ جتلانے کے
> لیے کہ ساحل کوسوں دور ہے اور حدِ نظر گلابی بارش کی جگہ گہرا کالا
> رنگ پھیل گیا ہے۔ان دونوں موقعوں پر ایک لمحے کے لئے انہوں
> نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔اُن کی آنکھوں میں ایک
> دوسرے کے لیے صرف اور صرف بے پناہ عشق تھا۔''۳۲

رحمٰن عباس کا یہ ناول اگر چہ موضوع کے لحاظ سے کوئی جدت نہیں رکھتا ہے

لیکن جس طریقے سے انہوں نے جنسی اورنفسیاتی کشمکش کو پیش کیا ہے اس سے موضوع میں جدت پیدا ہوگئی ہے اورقاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔دراصل جنس ایک فطری عمل ہے لیکن زیر بحث ناول میں اس جنس کی تشنگی کو ہر کردار کے اندرمحسوس کیا جاسکتا ہے۔مس جمیلہ سے لے کرناول کا ہر کرداراس تشنگی میں ڈوبا نظر آتا ہے۔دراصل انسان کی بے وفائی کی سب سے بڑی وجہ بھی کسی نہ کسی طرح جنس کو ہی بتایا گیا ہے جواپنی تکمیل کے لئے مذہب، ذات، رنگ اورنسل سب بھول جاتا ہے لیکن اس بے وفائی میں صرف عورت نہیں بلکہ مرد بھی شامل دکھائی دیتا ہے۔ناول میں اسرار جب محمد علی کی ماں کا قصہ سنتا ہے تو وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہوجاتا ہے۔

''وہ گھر سے نکلا تو اس کا دل بُجھا ہوا تھا۔اُس کے قدم آہستہ
آہستہ جمیلہ مس کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔اُس کا دل بار بار
اس سے پوچھ رہا تھا کہ' آدمی بے وفائی کیوں کرتا ہے؟'۔''۳۳

لیکن جب اسرارمس جمیلہ کے گھر پہنچ جاتا ہےاوراس کے ساتھ رات گزارتا ہےتو اس کی کشمکش کچھ کم ہوتی ہے۔اُسے محسوس ہوتا ہے کہ جس بے وفائی کا سوال وہ خود سے کررہا ہے دراصل وہ خود بھی اس بے وفائی میں شریک ہے۔مس جمیلہ کے ساتھ اس کے جنسی تعلقات اورمس جمیلہ کا اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی پر غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ

"بے وفائی انسان کی فطرت ہے، بلکہ فطرت کا سب سے
اہم عنصر بھی ہے۔"۳۴

اسرار نہ صرف جمیلہ کے ساتھ بلکہ شانتی اور حنا کے ساتھ بھی جنسی تعلقات قائم کرتا ہے تو وہیں ناول کے دیگر کردار یوسف میمن اپنی بیوی درخشندہ کے علاوہ ایمل اور درخشاں ایک پیر کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کئے ہوئے ہے۔ اتنا ہی نہیں محمد علی کی ماں، شانتی کی ماں اور خود اسرار کی ماں بھی کسی نہ کسی کے ساتھ بے وفائی کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ناول کا ہر کردار جنسی تشنگی کو محسوس کرتا ہے اور اس کی تکمیل کے لئے تمام حدود کو فلانگ کر جاتا ہے۔ جنس پر بات کرتے ہوئے مصنف لکھتا ہے۔

"جنسی عمل ایک جذبۂ بے پیر ہے۔ ایک خود ساختہ قوت
ہے جو خود آگاہ اور خود گام ہے۔ اس تارِ نفس کو کوئی راستہ نہیں بتاتا
راستہ خود بن جاتا ہے۔ جذبہ عشق کی طرح جذبۂ مجامت بھی بے
خطر آتش نمرود کی طرف بڑھتا ہے۔"۳۵

پلاٹ کے اعتبار سے رحمٰن عباس کا یہ ناول اہم ہے۔ ناول میں بہت سارے واقعات ہونے کے باوجود بھی اس کا پلاٹ گھٹا ہوا اور مضبوط ہے اور اس میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں انہیں نہایت سلیقے کے ساتھ برتا گیا ہے۔ ناول فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور ناول کا آغاز بھی ناول کے اختتام سے

ہوتا ہے اس کے بعد اسرار اور اس کی زندگی سے جڑے ہوئے تمام واقعات کو پیش کیا گیا ہے ۔ناول کا پلاٹ ممبئی کے سماجی زندگی کے ارد گرد طواف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔ممبئی دراصل ایک ایسا مقام ہے جہاں ہر انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے آتا ہے اور جنہیں پورا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے ۔اسرار اور مس جمیلہ کی کہانی کے بعد ممبئی میں شانتی طوائف اور پھر حنا سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے ۔حنا سے ہی اس کے والد یوسف اور ایمل کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے یہاں کہانی ایک نیا رنگ لیتی ہے اور ایک ایسے طبقے سے روشناس کراتی ہے جو آزاد ذہن کے مالک ہیں جو سماج کے بندھے ٹکے اصولوں کی پروا کئے بغیر خود کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں یہاں مذہب کے اصولوں پر بھی کھل کر تنقید دیکھنے کو ملتی ہے ۔اس کے بعد پھر کہانی اسرار اور حنا کی طرف لوٹ آتی ہے اور آخر میں دونوں کی موت پر یہ ناول ایک المیہ پر ختم ہوتا ہے ۔ناول ''روحزن'' میں مصنف نے جتنے بھی واقعات کو پیش کیا ہے اور ان واقعات کی کوکھ سے جتنی بھی کہانیوں نے جنم لیا ہے ان میں کوئی بھی غیر ضروری واقعہ معلوم نہیں ہوتا ہے، ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ کہیں کہیں مصنف نے دقیق اور گہری فلسفیانہ بحث چھیڑ کر عام قاری کے لئے کہانی کو کچھ لمحے کیلئے بوجھل بنا دیا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے قاری خود کو اس بوجھ سے الگ ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے ۔یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ناول میں جتنے بھی واقعات شامل ہوئے ہیں تمام واقعات کسی نہ کسی سطح پر آ کر ایک ہی شئے میں ضم ہوجاتے ہیں

اور یہ شئے مرد اورعورت کا وہ جسمانی جذبہ ہے جوجنسی جذبے میں آخر کارمنتقل ہوجاتا ہےلیکن یہ جنس کس طرح بے راہ روی کی طرف انسان کو لے جاتا ہےاس کی منفی تصویر بھی ناول میں دیکھنے کوملتی ہے۔

''ہوا یوں تھا کہ پڑوس کے ایک گاؤں میں واقع ، مدرسہ اہل عبث الفرجاء البلادات العربیہ ، کاایک معلم مدرسے کے پیچھے کی جھاڑیوں میں ایک سفید رنگ کی بکری کے ساتھ مباشرت کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔ جب پنچایت میں اس سے پوچھا گیا کہ وہ ایسی مذموم حرکت کیوں کررہا تھاتو اُس کا جواب تھا، بکری میری مرحوم اہلیہ کی ہم صورت ہے۔ مجھے ایسا لگتا ہے میری بیوی کی روح بکری میں جاں گزیں ہے۔''[۳۶]

مندرجہ بالا اقتباس سے انسان کی حیوانیت کی وہ تصویر دیکھنے کوملتی ہے جس میں جنس کا جذبہ اس قدر سرایت کرجاتا ہے کہ وہ انسان اور جانور میں فرق کرنا بھول جاتا ہے۔ یہاں جنس جنس نہیں رہتا ہے اورانسان انسان نہیں بلکہ ایسی صورت میں انسان کی وہ بے ضمیری سامنے آتی ہے جس کے لئے اُسے پیدانہیں کیا گیا ہے بلکہ اشرف المخلوقات کا درجہ دے کراسے کائنات کی سب سے بہترین اوراعلیٰ تخلق تصور کیاجاتا ہے۔

رحمٰن عباس کے اس ناول میں کردار نگاری کے بھی اعلیٰ ثبوت دکھائی دیتے

ہیں ناول کے مرکزی کرداروں میں اسرار اور حنا قابل تعریف ہیں۔ ان کے علاوہ دیگر کرداروں میں یوسف میمن، مس جمیلہ، درخشاں، محمد علی، بوراشد، وردۃ السعادۃ، شانتی، اسلم، موسیٰ بھائی، مادھوری، عثمان وغیرہ شامل ہیں۔ ناول کے مرکزی کردار اور ضمنی کردار ناول کی بنت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ اسرار کا کردار ایک ایسے نوجوان کا کردار ہے جو قدم در قدم ازلی محبت کا متلاشی نظر آتا ہے آخر میں مصنف نے جس موڑ پر لا کر کہانی کو ختم کیا اُس ایسے سے کسی حد تک اس کردار نے قاری کی ہمدردی حاصل کی ہے۔ اسرار کا کردار عصر حاضر کے اس نوجوان طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو ایک طرف بے روزگاری میں مبتلا ہے تو دوسری طرف جنسی اور ذہنی کشمکش میں۔ ناول کا دوسرا کردار حنا کا ہے یہ نسوانی کرداروں میں سب سے زیادہ فعال و متحرک دکھائی دیتا ہے اس کردار میں جو ذہنی تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ دراصل اس کے باپ یوسف میمن کی وجہ سے آتی ہے اور یہ کردار اپنے باپ کی طرح آزادانہ زندگی گزارنے کے حق میں دیکھائی دیتی ہے۔ اسرار سے اس کی محبت اور پھر اس محبت کے انجام نے قاری کو کہانی کے آخر میں پہنچا کر ایک ایسے ماحول میں دھکیل دیا جہاں پہنچ کر قاری اسرار اور حنا سے ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

''موج پر موج ٹوٹ رہی تھی جس کے سبب اسرار تیرنے کی
کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ دوسری طرف حنا نے دونوں
ہاتھ اُس کی گردن میں ڈال کر اسے بھینچ کر پکڑ لیا تھا۔ ایک دوبار

اسرار نے حنا کا ایک ہاتھ گردن سے الگ کر کے اوپر ابھرنے اور
تیرنے کی کوشش کی لیکن اس کی اس کوشش کو حنا سمجھ نہیں سکی ، مستزاد
حنا نے طاہر نیم بسمل کی سی تڑپ کے ساتھ اسرار کی گردن پر گرفت
مزید سخت کردی دوبارہ سمندر نے اوپر اچھالا صرف یہ جتلانے کے
لئے کہ ساحل کوسوں دور ہے اور حد نظر گلابی بارش کی جگہ گہرا کالا
رنگ پھیل گیا ہے ۔ ان دونوں موقعوں پر ایک لمحے کے لئے
اُنھوں نے ایک دوسرے کی آنکھوں میں دیکھا۔اُن کی آنکھوں میں
ایک دوسرے کے لئے صرف اور صرف بے پناہ عشق تھا۔'' ۳۷

ناول کے دیگر نسوانی کرداروں میں ایمل ، درخشاں ، ودی اور مس تھامس ، شانتی ، کا بھی ہے ۔ ایمل ایک ایسا نسوانی کردار ہے جو بہت امیر ہے اس کا شوہر کاروباری ہے اور عرب سے جب یہ ہندوستان آتے ہیں تو یوسف میمن کے ساتھ ان کی ملاقات ہو جاتی ہے یہ آزاد طبیعت کی عورت ہے جس میں جنسی تشنگی بھری ہوئی ہے ساتھ ہی یہ اچھی طرح سے جانتی ہے کہ یوسف جیسے کردار کا کہاں کب اور کیسے استعمال کرنا ہے۔ یہ ایک تجربہ کار عورت ہے اور یوسف میمن کے ساتھ اس کے جنسی تعلقات اور ذہنی خیالات نے یوسف میمن کو ایک نئ ڈگر پر پہنچا دیا ایک ایسی ڈگر جس پر چل کر اس نے اپنی بیوی درخشاں کو بھی چھوڑ دیا۔نسوانی کرداروں میں ایمل کا کردار سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہے جو ہر موضوع پر یوسف کے ساتھ بات کر لیتی

ہے اور دھیرے دھیرے اپنے خیالات بھی یوسف کے ذہن میں ڈال دیتی ہے جس کو اپنا کر یوسف ہر ایک موضوع پر اپنی بیٹی کے ساتھ کھل کر بات کرتا ہے۔

ایمل کے علاوہ مس جمیلہ کا کردار بھی ناول کا اہم کردار ہے۔ پیشے سے یہ ایک ٹیچر ہے جو اپنے اندر جنسی بھوک کو سمیٹے ہوئے ہے اور جب اپنے طالب علم اسرار کو اپنے گھر پر بھیگے ہوئے بدن کے ساتھ دیکھتی ہے تو اس کے اندر یہ جذبۂ تکمیل پانے کے لئے اسرار کے ساتھ لپٹ جاتی ہے اور اسے اپنی آغوش میں لیتی ہے اس مقام پر پہنچ کر مس جمیلہ کچھ اس طرح سوچنے لگتی ہے۔

> ''وہ کس قدر اپنے نفس کی ایمائیت کو محسوس کرتی ہے؟ اُسے معلوم نہیں تھا، لیکن وہ حیران تو تھی۔ وہ حیران اس بات پر بھی تھی کہ خواہش کا کوئی مذہب کیوں نہیں ہوتا؟ خواہش اس قدر طاقت ور کیسے ہوسکتی ہے کہ ساری تاویلیں چند ساعتوں میں تحلیل ہو جائیں اور دل بدن کے تقاضوں کے گرد منڈلانے لگے۔'' ۳۸

مس جمیلہ کے علاوہ ناول میں شانتی کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے یہ ایک ایسی طوائف ہے جو اپنے اندر ایک ایسے کرب کو دبائے ہوئے ہے جس کا اظہار وہ صرف اسرار کے ساتھ کرتی ہے۔ دراصل اسرار اور شانتی دونوں ایک ہی طرح کے خواب دیکھتے ہیں جس میں وہ اپنے قریبی کے ساتھ خواب میں مباشرت کرتے ہیں ۔شانتی دراصل بچپن میں اپنی ماں کو کسی دوسرے کے ساتھ مباشرت کرتے ہوئے

دیکھتی ہے جس وجہ سے اُسے اکثر یہ خواب آتا ہے کہ اس کا باپ اس کے ساتھ مباشرت کرتا ہے شانتی کا تعلق لاتور گاؤں سے ہوتا ہے جو زلزلے کی زد میں آجاتا ہے اور شانتی کا پورا خاندان اس میں مرجاتا ہے اس کے بعد شانتی اپنے ماموا شوک کے ساتھ پونہ آجاتی ہے جہاں اشوک اس کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتا ہے اور پھر بغیر شادی کے اس کو چھوڑ دیتا ہے۔ شانتی کا کردار طوائف کی زندگی کی نمائندگی کرتا ہے، یہ ایک ایسا کردار ہے جو کم سن ہونے کے باوجود اس پیشے کے تمام اصولوں کو اپناتی ہے اور ایک تجربہ کار طوائف کی طرح کسی بھی طرح کے گاہکوں کو نمٹاتی ہے۔

''شانتی تیرہ چودہ سال کی عمر میں روزانہ بیس تیس گاہک نمٹا رہی تھی۔ شرابی، لچے، آوارہ، شاعر مزاج، ٹپوری، مذہب پرست، فرقہ پرست، شریف النفس اور سماجی رتبہ رکھنے والے لوگ اُس کے اندر اپنے خون کی گرمی کو اُنڈیل کر خوش وخرم اپنی مہذب دنیا میں لوٹ جاتے تھے۔ یہ ایک معمول تھا شانتی کی دلچسپی اس بات میں نہیں تھی کہ کون اُس پر کس طرح رینگتا ہے یا کس وحشت سے اُس کو روندتا ہے۔ وہ زمین تھی۔ کیا طوائف زمین کے انحطاط کی علامت ہے؟ زرخیزی اور تخلیق کی موت کا اعلان ہے؟ خدا جانے، لیکن شانتی ایک ایسی زمین تھی جس میں تخلیق اور زندگی فنا ہو رہی تھی۔ یہ فنا

پذیری بھی ارتقاء کے لئے لازمی تھی۔ شانتی اس بات سے یقیناً
واقف تھی کہ اس کا وجود بھی اہم ہے۔ اُس کی روح کے سارے چور
راستے جو اُس کے جسم کی شریانوں سے گزر کر اُس کے رحم اور بچہ دانی
تک آتے تھے، اب لگ بھگ رس رس کر مریل ہو گئے تھے۔ اُس کی
کوکھ ایک تاریک چاند تھا جس کا نہ کوئی مدار تھا نہ کوئی اس کے مدار
میں تھا'' ۳۹؎

مذکورہ بالا اقتباس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ طوائف کے اندر نسوانیت ہمیشہ زندہ رہتی ہے اور وہ اس دلدل میں مجبوراً اُتار دی گئی ہوتی ہے لیکن اُسے اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ وہ اس دلدل سے نہیں نکل سکتی ہے لیکن پھر بھی اس کے اندر یہ کیفیت موجود رہتی ہے کہ وہ کسی طرح یہاں سے نکل جائے۔

مس تھامس کا کردار ایک ایسا نسوانی کردار ہے جو ایمل کے عقیدے کی پیروی کرتا ہے یہ ایک کالج کی پرنسپل ہے لیکن اس نے شادی نہیں کی ہے۔ پونہ کی پارٹی میں جب یوسف اسے اپنی آغوش میں لیتا ہے تو مس تھامس اسے بتاتی ہے کہ وہ اُس کی زندگی میں آنے والا پہلا مرد ہے۔ یہ کردار اصل مرد کے بجائے عورتوں میں دلچسپی لیتا ہے اور ہم جنسی کے مرض میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔

''مس تھامس نے اسے امریتا شیر گل کی بارے میں کچھ
باتیں بھی بتائیں جن میں یہ بات بھی شامل تھی کہ امریتا شیر گل کے

جہاں متعدد مردوں سے تعلقات تھے وہیں چند عورتیں بھی اس کی
محبت میں شریک تھیں۔ مس تھامس کی یہ بات سن کر یوسف نے ایک
پل کے لئے کچھ سوچا پھر پوچھا: کیا آپ سنگر مما سے محبت کرتی
ہیں؟'' ....تھوڑی دیر بعد مس تھامس کی آنکھوں میں منجمد اشتہا
پگھلنے لگی۔ ذات کا کنواں طلسمی طور پر لبریز ہوکر بہتا رہا۔ اُکھڑتی
ہوئی سانس میں مس تھامس نے یوسف سے کہا 'تو میری لائف میں
پہلا مرد ہے، ورنہ سنگر مما اور دوسری عورتیں زندگی میں آتی رہی ہیں۔
'تو میری زندگی میں پہلا مرد ہے۔'' [۴۰]

ناول کے دیگر کرداروں کے علاوہ یوسف میمن کا کردار ناول کا اہم کردار ہے۔ اسرار اور حنا کے بعد یہی کردار سب سے زیادہ جاندار اور فعال نظر آتا ہے یہ کردار ارتقائی منزلیں طے کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا کردار ہے جو ایمل کے ساتھ مل کر اپنی بیوی اور گھر کے دیگر افراد کو بھول جاتا ہے۔ ایمل جو کہ بیوروکریٹ ہے اور پڑھی لکھی ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہے یوسف کو نئے مذہب کے ساتھ متعارف کراتی ہے اور جنسی تعلقات اس کے ساتھ قائم کرتی ہے۔ یہاں یوسف اپنے مذہب کو بھول کر ایک نئی زندگی سے ہمکنار ہو جاتا ہے اور اپنے گھر سے علیحدگی اختیار کر لیتا ہے ہر موضوع پر کھل کر بات کرتا ہے اپنے کمرے میں عریاں تصویر لٹکا کر رکھتا ہے اس تبدیلی کو دیکھتے ہوئے سارے گھر کے افراد حیران

ہوجاتے ہیں کہ وہ شخص جو کچھ وقت پہلے مذہب کا پابند تھا کس طرح آزاد ذہن کا مالک بن گیا لیکن اس کے ان نئے تصورات نے جہاں اس کی بیٹی حنا کو کافی خوش کردیا تو وہیں اس کی بیوی پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا یوسف نے ایمل کی قربت کے بعد اپنی بیوی سے کنارہ کشی کرلی اور اسے لگا کہ اس کی بیوی ایک بدبودار کیڑا ہے اُسے ندامت ہونے لگی کہ کس طرح اب تک وہ ایسی عورت کو جھیل رہا تھا۔

''یوسف نے اس کے جسم کی طرف کبھی اس طرح متجسس نگاہوں سے نہیں دیکھا تھا۔ اُسے درخشاں بدہیت لگی۔ اُس کے پیٹ اور کمر کے گرد جمی چربی کریہہ لگ رہی تھی۔ اس کے پستان گوشت کی دکان پر لٹکتے ہوئے معدے کی طرح بدبودار محسوس ہوئے۔ اُس نے سوچا اس بدصورتی کو اُس نے اب تک کیوں محسوس نہیں کیا تھا۔''[۴۱]

ایمل سے ملنے اور علیحدگی کے بعد جب کبھی اس کی بیٹی حنا کچھ پوچھتی تو یوسف فلسفیانہ انداز میں جواب دیتا۔

''ہاں، پہلے صرف موجود تھا۔ اب خوش ہوں۔'

اپنے باپ کا جملہ اس نے مسکراتے ہوئے دہرایا اور پوچھا 'کیا مطلب؟'

'اب میں اپنے آپ سے بہت قریب ہوں اور میں 'اپنے آپ' کو قبول کرنے لگا ہوں۔ ورنہ ہم جس طرح کے سماج میں پیدا

ہوتے ہیں وہاں ہم دوسروں کی نقل ہوتے ہیں۔ ہمارا ہر عمل دوسروں
کی توقع اوران کے عمل کی کاپی ہوتا ہے ۔ یہاں تک کے ہمارے
خیالات بھی محض نقل ہوتے ہیں۔اس نے ایک نظر حنا کو دیکھا اوراپنا
جملہ مکمل کیا :''ہم اُس وقت صرف موجود ہوتے ہیں جب ہم خود کو
دریافت کرنے کے بجائے دوسروں کی نقل کرتے ہیں۔''[۴۲]

یوسف کے علاوہ ان کی بیوی درخشاں کا کردار ایک ایسی عورت کا کردار ہے جواپنے شوہر کی بے وفائی کوکسی کے جادوٹونے کا نام دیتی ہے اور بابا کی درگاہ میں جا کر صوفی صفت پیر سے کچھ تعویذ لاتی ہے اوراسے یقین ہوتا ہے کہ ایک دن اس کا شوہر واپس آئے گا لیکن یہ محض اس کا وہم اور سادہ لوحی ہے جو یوسف کی بے وفائی کو پہنچان نہیں پاتی ہے لیکن درخشاں بھی کچھ وقت کے بعد اس پیر کو گھر پر بلانا شروع کرتی اوراس کی ہر کہی ہوئی بات پر عمل کرتی ہے اب پیر کے علاوہ درخشاں کسی دوسرے انسان کی بات پر عمل نہیں کرتی ہے۔

''عمارت کی سیڑھیوں پر عموماً اندھیرا رہتا تھا۔ وہ سیڑھی کے
پاس ایک منٹ کے لئے رک گئی۔ جب اس کی آنکھیں نیم
اندھیرے میں چیزوں کو بہتر طور پر وہ دیکھنے لگیں تو وہ سیڑھیاں
چڑھنے لگی۔اوپر سے پیر صاحب کواترتے ہوئے دیکھ کراسے عجیب
لگا۔ یہ وہی پیر صاحب تھے جن کی معتقد اس کی ماں تھی۔ جب وہ

پیر صاحب کے پاس سے گزری اُس وقت پیر صاحب کرتے سے
اُڈنے والی خوشبو اُس کے نتھنوں میں سما گئی۔ وہ گھر میں داخل ہوئی تو
اس کی ماں کچن میں کسی کام میں مصروف تھی وہ جا کر صوفے پر دراز
ہوگئی۔ صوفے پر اس نے دوبارہ پیر صاحب کے عطر کی خوشبو کو محسوس
کیا۔'' ۳۴؎

ناول میں محمد علی کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔ اس کردار کا شمار ناول کے ضمنی کرداروں میں ہوتا ہے لیکن اس کی موجودگی لگ بھگ ناول کے ادھے سے زیادہ ابواب میں دیکھنے کو ملتی ہے یہ اسرار کا دوست ہے اور جس کھولی میں اسرار رہتا ہے اسی میں محمد علی بھی رہتا ہے۔ اسرار پہلے سے ممبئ آیا ہوتا ہے لیکن اپنے اندر کے کرب کو کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیتا ہے ممبئ میں اسرار کو بہت سارے تاریخی مقامات کی سیر کراتا ہے اور ساتھ ہی اسرار کو جسم فروش لڑکیوں کے ساتھ دام کے متعلق بات کرنا بھی سکھاتا ہے۔ گاؤں جا کر اسرار کو معلوم ہوتا ہے کہ محمد علی کے والد نے دوسری شادی کر لی ہے اور محمد علی ریحانہ کی اولاد ہے جو کسی دوسرے مرد کے ساتھ بھاگ گئی ہوتی ہے لیکن بعد میں اس کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے یہ سن کر اسرار کو محسوس ہوتا ہے کہ محمد علی کتنے بڑے درد کو اپنے اندر چھپائے بیٹھا ہے اور جس کا علم آج تک کسی کو نہیں ہوا۔

'' محمد علی کی زندگی اور شخصیت میں بہت ساری متضاد حقیقتیں

دکھائی دینے لگیں۔ اُس نے محسوس کیا محمد علی کے دل پر گہرا زخم ہے
جسے وہ ممبئی کی آوارگیوں میں فراموش کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''۴۴

زیرِنظر ناول کردار نگاری کی کسوٹی پر اترتا ہوا دکھائی دیتا ہے اس ناول کے مرکزی اور ضمنی کردار ہر طرح کے واقعے کو سمیٹے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ۔حنا ،اسرار اور یوسف میمن کا کردار ناول میں اپنی الگ اہمیت رکھتے ہیں یہ کردار ایک طرف انسان کی بدلتی ہوئی سوچ کو ظاہر کرتے ہیں جس کا ثبوت یوسف میمن کا کردار ہے تو دوسری طرف انسان کا جنسی اور ذہنی کشمکش میں ہونا بھی ظاہر کرتے ہیں اس کی بہترین ترجمانی اسرار کرتا ہے جو ممبئی آکر ممبئی سے لطف اندوز ہونے کے بجائے جنسی اور نفسیاتی، کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔

رحمٰن عباس کے ناول 'روحزن' میں مکالمہ نگاری کے بھی بہترین ثبوت دیکھنے کو ملتے ہیں۔ دراصل مکالمہ اظہار خیال کا بہترین ذریعہ ہے اس سے انسان کے احساسات ،جذبات کا علم ہوتا ہے بہترین فنکار وہی ہے جو عمر ،رشتہ ، پیشہ،غرض ہر طرح کے طبقے کو مدنظر رکھے ساتھ ہی اس بات کو بھی فنکار ذہن میں رکھے کہ جو مکالمہ جس کردار کی زبان سے ادا ہوا ہے وہ اس کے پیشے کی مکمل ترجمانی کرے جہاں تک ناول 'روحزن'' کا تعلق ہے یہ ناول مکالمہ نگاری کے بہترین نمونے فراہم کرتا ہے۔ ناول میں اسرار اور مس جمیلہ کے مکالمے ہوں یا اسرار کے حنا کے ساتھ یا پھر ایمل کا یوسف کے ساتھ تبادلہ خیال ہر ایک موڑ پر مکالمے کرداروں کی ذہنی،

جذباتی اور جنسی کیفیت کی بہترین ترجمانی کرتے ہیں۔مس جمیلہ جب اسرار کو بھیگے ہوئے لباس میں دیکھتی ہے تو اس کے اندر جنسی خواہشات سر اُٹھانے لگتی ہے۔ بارش میں اسرار کا گھر جانا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہاں اسرار مس جمیلہ کو ابھی اپنی ٹیچر ہی سمجھ رہا ہے لیکن مس جمیلہ کے اندر کوئی اور ہی جذبہ جنم لیتا ہے۔

"لنگی اور ٹی شرٹ پہنے مِس جمیلہ کے روبرو بیٹھے ہوئے اُسے تھوڑی سی جھجک محسوس ہو رہی تھی۔جمیلہ مس کو اس بات کا احساس تھا۔ اِس احساس کو زائل کرنے کے لئے اُس نے کہا' آم کا پیڑ کدھر گرا ہے؟'ارے مس اکدم گیٹ کے سامنے ، رستہ بند ہو گیا ہے ۔ بارش رکے گی تبھی ہی جھاڑ کو ہٹا سکتے ہیں۔'اچھا۔مس نے دوبارہ کھڑکی سے باہر دیکھا ۔ بارش جاری تھی

'مس......اللہ کرے جلدی سے بارش بند ہو جائے۔

'اور اگر نہیں ہوئی تو' شوخ لہجے میں مِس کی زبان سے ادا ہوا۔

'تو میری واٹ لگ جائے گی' اسرار نے جواب دیا۔

'کیا بولا......'

'ارے مس،مطلب واپس جانے کا پروبلم ہوگا نا'

تیرے گھر میں یا آجو باجو میں کسی کے ادھر فون ہے۔تو
میرے موبائل سے فون کر کے بول دے۔اور بول اگر بارش
نہیں رکی تو ادھر رکے گا۔'' ۴۵

ناول میں طوائف کی زبان سے ادا ہوئے مکالمے اسی طبقے کی بھرپور عکاسی کرتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

'' شانتی نے اُس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' کتنے ٹائم کے
بعد آیا رے؟'

'ہاں! نئی نئی نوکری تھی۔'

'ہم لوگ ہچ فری ہیں۔' شانتی نے منھ بناتے ہوئے کہا۔

'سچ میں، بہت جھمیلا تھا' اسرار نے کہا

'تیرا لاسٹ ٹائم میرے کو بہت یاد آیا بعد میں' شانتی نے بستر
کی طرف جاتے ہوئے کہا۔

'میں بھی تیرے کو یاد کیا تھا۔'

'چل جھٹے' شانتی نے کہا۔اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا شانتی
نے پھر کہا:'پھوکٹ کی پھیکم پھاک مت کر۔'' ۴۶

ناول میں محمد علی اور سلیم گھارے کے مکالموں سے ان کی شخصیت کی بہترین ترجمانی ہوتی ہے یہ دونوں کردار گاؤں سے تعلق رکھتے ہیں اور پھر ممبئ آکر کھولی میں

رہنے لگتے ہیں یہاں کی زبان بھی کسی حد تک سیکھ لیتے ہیں اور جب سلیم گھارے محمد علی کولڑکیوں کے متعلق اپنا تجربہ بیان کرتا ہے تو کچھ اس طرح کہتا ہے۔

''محمد علی نے پوچھا: 'پھر تو نے کیا کہا۔'

'ارے یار میرے کو اُس کا اسٹائل سمجھ میں آ گیا تھا، میں ڈائرک بولا: 'واپس کب ملتے ہیں۔'

'تو وہ کیا بولی؟'

'موقع دیکھ کر میں فون کروں گی۔'

'ارے سالا! ابھی تو وہ بول رہی تھی لٹ گئی۔'

'ناٹک یار۔ ہر عورت کا اسٹائل ہوتا ہے۔ شکار سب کو کرنے کا رہتا ہے۔لیکن سیفٹی کے ساتھ۔'

'سیفٹی مطلب؟'

'سیفٹی بولے تو ایڑا بن کے پیڑا کھانے کا اور کسی کو ہوا بھی نہیں لگنے دینے کا۔' ملازم نے وضاحت کی۔

'تو تو سالا ایکسپرٹ ہوگیا۔' محمد علی نے کہا

'تو کیا کمتی اکسپرٹ ہے۔ بھینی کو پھانس رکھا ہے۔ سالے تیرا مال تو ایکدم کنولا ہے۔'' ۲۷

مندرجہ بالا مکالموں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو ممبئی اور ممبئی

کے دور دراز گاؤں کی زبان سے گہری واقفیت ہے ۔ ناول میں بہت سارے مقامات پر اس طرح کی گفتگو دیکھنے کو ملتی ہے ۔ ایمل اور یوسف کے مکالموں سے بھی مصنف کی مکالمہ نگاری پر دسترس دکھائی دیتی ہے یہاں دونوں کے درمیان جو مکالمے ہوتے ہیں اس سے فلسفیانہ انداز اُبھر کر سامنے آتا ہے۔ دراصل ایمل بات چیت کرتے ہوئے تعلیم یافتہ اور باشعور عورت دکھائی دیتی ہے جو مذہب کے بندھے ٹکے اصولوں سے آزاد ہو چکی ہے اور ایسے خیالات کی پیروی کرتی ہے جس میں انسان کی آزادی ہی سب کچھ ہوتی ہے ۔ حنا اور اسرار مال سے باہر نکلتے ہیں تو اردگرد کا ماحول دیکھ کر حنا نظریں موڑ لیتی ہے لیکن اسرار حنا سے کچھ اس طرح کی باتیں کرتا ہے ۔

''ہاں ۔ بے شرم کہیں کے ....اسرار نے کہا۔

'ایسا کیوں کرتے ہیں لوگ، میری سمجھ میں نہیں آتا۔' حنا نے کہا۔

'پیار کرتے ہیں، پیار میں ایسا ہوتا ہے ۔' اسرار نے کہا۔

'گندے لوگ ۔' اسرار کے جواب پر حنا نے ایک پل خاموشی اختیار کی اور پھر کہا۔

'اس میں کیا گندہ ہے؟' اُس نے پوچھا

'کھلے عام اس طرح کی حرکت گندی ہے نا؟'

'پیار اندھا ہوتا ہے ۔' اسرار نے کہا۔'' ۴۸؎

ناول میں منظر نگاری بھی ایک اہم جز ہے یہ اور بات ہے کہ کچھ ناقدین اس جُز کو ناول کا لازمی جز قرار نہیں دیتے لیکن منظر نگاری جتنی بہترین ہو ناول اُتنا ہی کامیاب مانا جاتا ہے۔ دراصل منظر سے مراد کسی واقعے یا ماحول کی ایسی تصویر کشی کرنا کہ پورا منظر قاری کی آنکھوں کے سامنے آجائے اور اسے یوں محسوس ہو کہ وہ خود اس منظر کو پڑھنے کے بجائے آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔ علی عباس حسینی منظر نگاری کے متعلق اپنی کتاب ''اردو ناول کی تاریخ اور تنقید'' میں یوں رقمطراز ہیں:

> ''منظر نگاری کی وجہ سے زماں ومکان کی تعین ہوتی ہے، اوقات اور موسموں کا بیان، کمروں اور مکانوں کے خاکے آبادیوں کے نقشے، اسباب ضرورت وزینت کی تصویریں اور ناچ رنگ، میلو، ٹھیلوں، جلسہ جلسوں کے معرکے اسی جز سے متعلق ہیں۔ ناول نگار کو چاہئے کہ وہ ان امور کو اس سلیقے اور اس انداز سے بیان کرے کہ پڑھنے والے کے سامنے بالکل تصویر کھینچ جائے شاعری میں ان کو محاکات کہتے ہیں۔''۴۹

اگر اس پس منظر میں زیر بحث ناول کو دیکھا جائے تو یہ ایک کامیاب ناول ہے۔ ناول میں ممبئ شہر کی منظر نگاری ہو یا کسی تاریخی مقام کی، گاؤں کی ہو یا سمندر میں چل رہی کشتی کی، فٹ پاتھ کی زندگی ہو یا پھر کھولی میں رہنے والے لوگوں کی، دراصل کسی بھی جگہ یا واقعے کا منظر کیوں نہ ہو رحمٰن عباس نے اسے اس

طرح کھینچا ہے کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے ان مناظر کو دیکھ رہا ہے۔ ناول کے آغاز میں ہی منظر نگاری کا بہترین ثبوت دیکھنے کو ملتا ہے دراصل مصنف نے ناول کے آغاز میں ہی ممبئ شہر کا بارش کے بعد جو نقشہ کھینچا ہے وہ قابل توجہ ہے۔

''ممبئ کے اطراف پھیلا ہوا سمندر بہت طیش میں تھا۔ وہ صدیوں سے جاری جنگ کو جیت کر جزیرے پر قبضہ کرلینا چاہتا تھا۔اُونچی اُنچی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور ساحلوں پر غصے میں اپنا سر پٹخ رہی تھی۔ لہریں اس طرح سر اُٹھارہی تھیں جیسے اُٹھ کر آسمان کو چھونا چاہتی ہوں۔ ان سرکش لہروں کو دیکھ کر ہیبت طاری ہورہی تھی۔ تین دنوں سے شہر میں بارش جاری تھی اوراب تو شہر کی شاہراؤں ، کشادہ سڑکوں اور تنگ وتاریک گلیوں میں بھی گھٹنوں گھٹنوں پانی جمع ہوگیا تھا۔ آسمان میں سوائے کالے بادلوں کے کوئی شئے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ شہر بھول گیا تھا سورج کی کرنیں کیسی ہوتی ہیں۔ آسمان میں چھید تھے جہاں سے ڈھار ڈھار پانی گررہا تھا۔ گویا آسمان میں بادل نہیں آبشار تھا۔ سمندر کا پانی زیر زمین نالیوں میں بہت اندر تک سرایت کرچکا تھا۔ بارش کے پانی کی نکاسی رک گئی تھی۔ بڑی بڑی نالیوں میں سمندر اور بارش کے پانی میں کشاکش

جاری تھی جس کے سبب نالیوں کی کنکریٹ کی دیواریں ٹوٹ پھوٹ
رہی تھیں اورمخلوط پانی زمین کی اندرونی پرتوں میں پھیلتا
جارہاتھا۔'' ۵۰؎

اس کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر جو منظر کشی کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو اس فن پر بھی دسترس حاصل ہے۔ اسرار جب سنڈاس کے اندر چلا جاتا ہے تو یہاں سنڈاس کی خستہ حالت کو دیکھ کر اسے حیرت ہوتی ہے ساتھ ہی سنڈاس کی دیواروں پر عریاں تصویر بنائی ہوئی تھیں۔ ایک طرف یہ شعر بھی لکھا تھا۔

؎ اس انجمن میں آپ کو آنا ہے بار بار
دیوار و در کو غور سے پہچان لیجئے

ممبئی کی کھولی کے آس پاس سنڈاس سے مصنف کو گہری واقفیت تھی۔ دراصل مصنف نے ناول میں جس کسی واقعے کا بھی نقشہ کھینچا ہے اس کی پرت در پرت کھول کر رکھ دی ہے۔ یہ تب ہی ممکن ہوتا ہے جب خود مصنف کو اس طرح کے تجربات سے دو چار ہونا پڑا ہو صرف تخیل پروازی سے ہی اختراع نہیں ہوسکتی ہے۔

ناول کے اختتام پر بھی ناول نگار نے المیہ منظر کو بہترین انداز میں پیش کیا ہے یہ وہ موڑ ہوتا ہے جب بارش تھمنے کے بعد اسرار اور حنا سمندر کے کنارے ایک دوسرے میں مدغم ہوئے ہوتے ہیں یہاں سمندر کی لہریں انہیں اپنی آغوش میں لے لیتی ہے اور ہمیشہ کے لئے سلا دیتی ہے۔

''لیکن دوسری موج نے زور دار حملہ کیا۔ حنا نے دونوں
ہاتھوں سے اُس کے پیروں کو پکڑا۔ وہ لڑکھڑا کر گرا۔ دونوں نے
ایک دوسرے کو پکڑا لیکن اس سے پہلے کہ وہ سنبھل پاتے شیطانی
موج نے انہیں گرفت میں لے لیا۔ موج پر موج ٹوٹ رہی تھی جس
کے سبب اسرار تیرنے کی کوشش میں کامیاب نہیں ہو رہا تھا۔ دوسری
طرف حنا نے دونوں ہاتھ اس کی گردن میں ڈال کر اسے بھینچ کر پکڑا
لیا تھا۔ ایک دوبار اسرار نے حنا کا ایک ہاتھ گردن سے الگ کر کے
اوپر ابھرنے اور تیرنے کی کوشش کی لیکن اس کی اس کوشش کو حنا سمجھ
نہیں سکی، مستزاد حنا نے طائر نیم بسمل کی سی تڑپ کے ساتھ اسرار کی
گردن پر گرفت مزید سخت کر دی۔ دوبارہ سمندر نے انہیں اوپر اُچھا
لا صرف یہ جتلانے کے لئے ساحل کوسوں دور ہے۔'' ۵۱

ان مناظر کے علاوہ بھی ناول میں متعدد ایسے مناظر دیکھنے کو ملتے ہیں جو منظر نگاری کے بہترین نمونے ہیں۔ منظر نگاری کے اس طرح کے نمونے دیکھنے کے بعد وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ رحمٰن عباس کا یہ ناول منظر نگاری کے حوالے سے بھی ایک کامیاب ناول ہے جس کو پڑھ کر قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے گویا وہ ہر منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہو۔

منظر نگاری کے ساتھ ساتھ جزئیات نگاری بھی ناول کا ایک اہم جز ہے، اس

میں مصنف واقعات اور حالات کے مطابق چھوٹے سے چھوٹے واقعات کا بھی ذکر کرتا ہے دراصل جزئیات نگاری میں ہر واقعے کی چھوٹی سی چھوٹی پرت کو بھی مصنف کھول کر بیان کرتا ہے ۔ جہاں تک ناول 'روحزن' کا تعلق ہے اس میں مصنف نے جزئیات نگاری کے بہترین نمونے پیش کئے ہیں اور جس واقعے کا بھی ذکر کیا ہے اس کے ہر ایک جز کو پیش کیا ہے۔دراصل عصر حاضر میں جزئیات نگاری ناولوں سے ناپید ہو رہی ہے لیکن رحمٰن عباس نے اس خلا کو کسی حد تک پُر کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ ناول اس کا اہم نمونہ ہے بقولِ سید محمد اشرف روحزن کا کوئی صفحہ ایسا نہیں جو عمدہ جزئیات کے ذکر سے خالی ہو۔ناول میں مصنف نے فٹ پاتھ کے کنارے ایک بدبودار منظر کی جزئیات کچھ اس طرح بیان کی ہے۔

> ''باکڑے کے نیچے ایک کالے رنگ کا کتا سو رہا تھا۔اسرار نے کُتے کو دیکھا ۔ کتے کا آدھا جسم فٹ پاتھ کے کنارے پر جمع گندے پانی میں تھا۔ کتے کی آنکھیں بند تھیں اور ناک کے پاس ایک موٹی سی مکھی ایک مٹھائی کے ٹکڑے پر السی گدھے کی طرح بیٹھ کر کُتے کی ناک کو دیکھ رہی تھی۔ کُتے کی ناک مکھی کے لئے یقیناً ایک سرنگ تھی۔ممبئ بھی بعض اوقات نو واردان کو سرنگ لگتی ہے۔فٹ پاتھ پر اسرار کو تین چار بڑے بل نظر آئے۔کُتے نے اچانک اپنی دُم زور سے ہلا کر ایک چوہے کو بھگایا جو دُم پر لگے کچرے کو کھانے کی

کوشش کررہا تھا۔ چوہا فوراً ایک بل میں گھس گیا۔''۵۲؎

جزئیات نگاری کا بہترین مرقع مصنف اس وقت بھی پیش کرتا ہے جب اسرار رفع حاجت کی غرض سے بیت الخلاء میں جاتا ہے لیکن بیت الخلاء کی خستہ حالت دیکھ کر اسرار کا دل پریشان ہو جاتا ہے لیکن رفع حاجت اسے بیت الخلاء میں رہنے پر مجبور کرتی ہے لیکن جیسے ہی اسرار کی نظر بیت الخلاء کی دیواروں پر پڑتی ہے تو عریاں تصویروں کو دیکھ کر اس کے اندر مس جمیلہ کے ساتھ گزاری ہوئی راتیں یاد آتی ہیں۔ دراصل بیت الخلاء کی دیواروں کے ساتھ ساتھ بیت الخلاء کا جو نقشہ رحمٰن عباس نے کھینچا ہے اس کا ہر ایک جز ہمارے سامنے آتا ہے۔

''تھوڑی دیر میں ہلکا اُجالا ہوا۔ اس اُجالے میں اُس نے دیکھا ایک کونے میں ماچس کی کچھ اَدھ جلی تیلیاں پڑی تھی۔ دو ایک جگہ موم بتی پگھل کر پھیلی ہوئی تھی جس پر سگریٹ بجھائی گئی تھی۔ دروازے کا نچلا کونا سڑ گیا تھا۔ سڑے ہوئے کونے میں اُس نے تین چار سفید کیڑوں کو ایک دوسرے پر رینگتے ہوئے دیکھا۔ پھر اس نے کموڈ کے منھ کی طرف دیکھا۔ ہلکے اجالے میں وہ دیکھ سکتا تھا کہ کموڈ کا منھ السر زدہ تھا۔ السر جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا اور بڑے بڑے پھوڑے نکل آئے تھے۔ ان پھوڑوں پر سفید کیڑے رینگ رہے تھے۔ ایک، دو، دس، بیس جانے کتنے کیڑے۔ ایک کیڑا کموڈ سے

نکل کراُس کی چپل پر چڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔اُس نے فوراً تھوڑا سا پانی ڈالا۔ کیڑا بہہ گیا۔لیکن جیسے ہی پانی کموڈ میں نیچے کی طرف گیا بدبو کاایک بھبکا اُٹھا۔گویا بدبو کی لہریں فضلے کی ناقابل یقین لطافت کے نیچے قید تھیں۔اُس نے ناک پر انگلیاں رکھیں اورنظریں اوپر اٹھائیں، وہ مبہوت رہ گیا۔سامنے لکڑی کے دروازے پر بے شمارفحش ڈرائنگ کے نمونے تھے۔ان نمونوں کے ذریعے جنسی فعل کو انتہائی غیر شائستہ انداز میں پیش کیا گیا تھا۔‘‘۵۳؎

اس کے علاوہ بھی ناول میں متعدد جگہوں پر جزئیات نگاری کے بہترین نمونے ملتے ہیں۔دراصل رحمٰن عباس کا کمال یہ بھی ہے کہ انہوں نے اس ناول میں ناول کے ہر ایک جز کو ملحوظ خاطر رکھاہے اوراپنے ناول میں ان اجزائے کے ساتھ انصاف بھی کیا۔ناول کی زبان اوراسلوب کے حوالے سے اگر بات کی جائے تو مصنف کومختلف زبانوں کی واقفیت ہے۔دراصل ناول میں اس جُز کی بھی اپنی ایک اہمیت ہوتی ہے اور جوناول جس ماحول کی عکاسی کرتاہے جس طرح کے طبقے کے ماحول،رسوم وعقائد کی ترجمانی کرتا ہے ضروری ہے کہ زبان بھی اس کی مکمل ترجمانی کرے۔ زبان کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے اطہر پرویز اپنی کتاب ’’ادب کا مطالعہ‘‘ میں یوں رقمطراز ہیں:

’’جس طرح بت تراش مجسمہ بنانے کے بعد اس کے

جذبات کی طرف متوجہ ہوتا ہے اوراس کی نوک پلک درست کرتا ہے
اسی طرح ایک بڑا ناول نگار اپنے ناول کے مواد کو مرتب کرنے کے
بعد اس کے فنی پہلوؤں کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ ناول کو ہر زاویے
سے دیکھتا ہے اوراس میں تناسب پیدا کرتا ہے یہ دیکھتا ہے کہ زبان
صحیح ہے اور پورے طور پر موضوع کے ساتھ ہم آہنگ ہے یا نہیں۔
ناول نگاری تخلیقی فن ہے ۔ اس کے لئے بھی اسی فنی اہتمام کی
ضرورت ہے جس کی شاعری میں توقع کی جاتی ہے ۔ یہاں بھی
الفاظ کی جادوگری اپنا کام کرتی ہے۔ یہاں تک کہ محاورات بھی اسی
اہتمام سے استعمال ہوتے ہیں، بات کتنی ہی اچھی ہو لیکن اگر
ڈھنگ سے نہ کہی جائے گی تو اس کے پڑھنے والے یا سننے والے پر
کوئی اثر نہ ہوگا۔'' ۵۴

اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ناول میں کچھ بھی کہہ دینا ہی کافی نہیں ہوتا ہے بلکہ اسے ایک اچھے ڈھنگ سے پیش کرنا بھی اچھے ناول نگار کی پہچان ہوتی ہے جہاں تک زیر بحث ناول ''روحزن'' کا تعلق ہے تو اس کی زبان سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے اگرچہ ناول میں متعدد زبانوں کے الفاظ شامل ہوئے ہیں جن میں ہندی، مراٹھی ،انگریزی، گجراتی اور علاقائی بولیوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ کہیں بھی قاری ان الفاظ کے استعمال سے بوجھل نہیں ہوتا بلکہ وہ کہانی کے ہر

واقعے کے ساتھ خود کو کہانی میں ڈھلتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ حنا کے والد یوسف اور ودی کے درمیان جو گفتگو ہوتی ہے وہ انگریزی زبان میں ہوتی ہے۔ اور ودی یوسف کو ایک انگریزی نظم بھی سناتی ہے۔

"Another Poem For You My Beloved

I accumulate heat in my braided hair,
I unwind them when my mind unwinds
letting it out ion you with my exfoliating tiredness
reposing in the alcoves you provide
you are the sauna, also the spa..........۵۵

نظم کے بعد سوالات اور جوابات انگریزی میں ہی یوسف اور ودی ایک دوسرے سے کرتے ہیں۔

'Can I ask you a direct Question?

'یوسف نے کہا: 'ضرور'

'What's your views on the religion?'

انگریزی کے علاوہ ہندی کے متعدد الفاظ جیسے سمبھوگ، سنیچر علاوہ ازیں سنسکرت کے الفاظ برہمانڈ، راکشش اور سمادھی وغیرہ استعمال کیے ہیں۔
رحمٰن عباس نے استعارات اور تشبیہات کا سہارہ لے کر بھی بڑے خوبصورت

انداز میں اپنی بات بیان کی ہے اور متعدد جگہوں پر ناول میں تشبیہات کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

''پہاڑوں کا رنگ کہیں سوکھی ہوئی ہلدی جیسا تھا تو کہیں پیاز کے چھلکوں کی رنگت اختیار کئے ہوئے تھا''۔۵۶؎

ناول کے دوسرے مقامات پر تشبیہات کا کچھ اس طرح استعمال کیا ہے۔

''شفاف پانی کی دیوار سطح آئینہ کی طرح تھی لیکن اپنے ہی عکس میں قید۔''

''ودی کے ہر جملے کو حنا اپنی آنکھوں کے سامنے فلم کی طرح دیکھ رہی تھی۔''

''دوسری طرف یوسف کی کایا کلپ زندگی اور ودی کی آب رواں سی بدمست زندگی سے بھی ایک نئی تعبیر وہ دریافت کر چکی تھی۔''۵۷؎

ناول میں دیگر زبانوں کے الفاظوں، استعارات اور تشبیہات کے استعمال نے ناول کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ہوئے دقت کا بھی احساس ہوتا ہے اور بعض مقامات پر یہ ناگوار بھی گزرتا ہے اسلئے یہ ناول کی خامی تصور کی جا سکتی ہے۔

رحمٰن عباس کا ناول ''روحزن'' اپنے اندر بے شمار پہلوؤں کو سمیٹے ہوئے ہے اور ہر پہلو اپنے اندر کئی کہانیاں رکھتا ہے۔یہ ناول اکیسویں صدی میں ابھرنے

والے ذہنی، جنسی اور نفسیاتی کشمکش کا عکاس ہے۔ ناول نگار نے ممبئ کی اس زندگی سے بھی روشناس کرایا ہے جو اسرار، محمد علی، فٹ پاتھ پر زندگی گزارنے والی بھکارن کے ساتھ ساتھ یوسف میمن جیسے لوگ بھی ہیں جو اپنے طریقے سے زندگی گزارتے ہیں۔ یہاں ہر طرف چہل پہل ہے ہر شخص دوڑ دھوپ میں لگا ہوا ہے لیکن ہر کردار کسی نہ کسی طرح نفسیاتی اور جنسی کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔ گاؤں سے آیا ہوا اسرار بھی اس کا حصہ بن جاتا ہے اور شانتی کے ساتھ ساتھ حنا کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتا ہے لیکن یہاں محمد علی، حنا، اسرار اور شانتی جیسے کردار دکھائی دیتے ہی جن کے ذہن ودل پر گہرا زخم ہے۔ ناول کے عنوان کو مدنظر رکھتے ہیں لفظ ''روحزن'' کا یہ مطلب ہے کہ جب کوئی انسان اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کو دوسرے کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرتے دیکھ لیں تو ان کی روح میں عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے تو اسرار، شانتی، حنا اور محمد علی جیسے کرداروں پر جو گھاؤ ہے جو کیفیت ہے وہ اسی وجہ ہے کہ ان میں ہر ایک نے اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کو دوسرے کسی کے ساتھ صحبت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔ اسرار نے اپنی ماں کو چچا کے ساتھ، حنا نے اپنی ماں درخشاں کو پیر کے ساتھ، شانتی نے اپنی ماں کو عریاں حالت میں اپنے پڑوسی کے ساتھ تو وہیں محمد علی نے اپنی ماں کو اس شخص کے ساتھ جس کے ساتھ وہ محمد علی اور شوہر کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ دراصل ان تمام کرداروں پر جو ذہنی اور نفسیاتی کشمکش دکھائی دیتی ہے اس کے سوتے کسی نہ کسی طرح ان دھاروں سے

بھی پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ناول میں مصنف نے مذہب کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے اور ساتھ ہی مذہب پرست لوگوں کو بھی، یہاں غور طلب بات یہ بھی ہے کہ متعدد جگہوں پر مصنف نے مذہبی کٹر سوچ پر طنز کیا ہے۔ پھر مولوی کا بکری کے ساتھ مباشرت کرنا ہو یا بابا علی کی درگاہ کے باہر صوفی پیر کا درخشاں کے ساتھ تعلقات، یہ وہ واقعات ہیں جو ظاہری مذہبی لبادے میں رہ کر گناہ اور جرم کو انجام دیتے ہیں اس مقام پر ناول نگار نے ان کے قول و فعل کے تضاد کو نمایاں کیا ہے۔ مصنف نے ایمل اور یوسف کے ذریعے شیطان کا بھی ذکر کیا ہے اور ایمل دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ابلیس غلط نہیں تھا بلکہ محض ایک سجدہ نہ کرنے سے نہیں نکالا گیا بلکہ اس کے پیچھے ایک بہت بڑی وجہ تھی، وہیں ایمل خدا کے لئے بھی کچھ ایسے متنازعہ جملے استعمال کرتی ہے جو ناول کا رُخ کسی اور طرف موڑ دیتے ہیں۔ ناول میں ایمل کے ذریعے یوسف کے خیالات میں تبدیلی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نئی نسل آزاد طبیعت کی ہے اور بندھے ٹکے اصولوں کی پروا کیے بغیر وہ ان مذہبی اور سماجی حدوں کو پار کر کے آزاد رہنا پسند کرتی ہے اور آزاد طبیعت انسانوں کا ایک گروہ بمبئی سے پونے بھی آتا ہے جہاں یہ لوگ اپنی آزادی کا جشن مناتے ہیں لیکن جس طرح کی آزادی شراب پی کر منظر عام پر آتی ہے اسے دیکھ کر ایسی آزادی سے قاری کا دل بھی اُکتا جاتا ہے۔

''بارہ بجتے ہی گھڑی سے ہلکی موسیقی کی آواز آئی۔ انھوں نے
رقص شروع کیا۔ یہ رقص بڑا عجیب تھا۔ ان کے قدم لڑکھڑا رہے تھے
اور جسم آڑے ترچھے انداز میں جھوم رہا تھا۔ یہ رقص افریقہ کے قبائل
کے رقص سے بہت مشابہ تھا بلکہ یہ وہ رقص بھی ہوسکتا ہے جو آدمی کے
اجتماعی لاشعور میں اب بھی محفوظ ہے اور شاذ ونادر روح کی سطح
پر نمودار ہوتا ہے۔ اس رقص میں آزادی کا احساس تھا۔ جسم اپنے جشن
پر خوش اور روح اپنی آزادی سے سرشار تھی''۔[۵۸]

اس اقتباس سے اس آزادی کے منفی اثرات پر بھی روشی پڑتی ہے۔ دراصل آزادی صرف جنس کی آزادی اور عرُیاں ہونے کا نام نہیں بلکہ آزادی تبادلہ خیالات کی ہونی چاہئے، اظہار رائے کی آزادی ہونی چاہئے جس طرح پونہ کی پارٹی میں آزاد طبیعت کے لوگ آزادی کا جشن مناتے ہیں، خود کو عرُیاں کر کے لباس کو بھی غلط قرار دیتے ہیں یہ ایسے مراحل ہیں ناول میں، جہاں قاری کی سوچ اس کے ضمیر، خودی اور اخلاق سے ٹکراتی ہے۔ دراصل یوسف کو ایمل سے ملنے کے بعد یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ اسے قید سے رہائی مل گئی ہے۔ یوسف اپنا مذہب ہی نہیں بلکہ ان نئے خیالات نے اس سے اس کی بیوی بھی چھین لی۔ ناول میں مذہب کو ہر فساد کا ذمے دار ٹھہرانے والے اس عقیدے کے سبھی لوگ شراب نوشی اور جنس میں مبتلا دکھائی دیتے ہیں۔

رحمٰن عباس کا یہ ناول ممبئی میں ہوئے دہشت گردوں کے حملوں کی بھی ترجمانی کرتا ہے اور ناول میں مندروں اور مسجدوں کے میناروں کو دیکھنے کے بعد اسے خیال آتا ہے کہ یہ مندر کے کلس اور مسجد کے مینار نہ جانے کتنے حادثات، فسادات اور قتل وغارت کے شاہد ہیں۔ اتنا ہی نہیں ناول میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد جو فسادات ہوئے کس طرح انسان نے وحشی کا روپ اختیار کر کے ایک دوسرے کو مذہب کے نام پر مارنا شروع کیا ''واگھ مارے کا موسیٰ کو رمیش'' کہہ کر پکارنا اس بات کی صاف علامت ہے کہ مسلمان نام ہونا یا ہندو نام ہونا کسی ایسی جگہ پر جہاں کسی بھی گروہ کی اکثریت زیادہ ہو جان بحق ہونے کے لئے کافی ہے۔ ناول نگار نے متعدد جگہوں پر اقلیتوں پر ہو رہے ظلم کی بھی عکاسی کی ہے ساتھ ہی ان تمام حادثات اور واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جو وقتاً فوقتاً ممبئی پر ہوئے، ممبا دیوی کا پریشان ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ممبئی شہر پر آفتیں آتی رہیں گی اور برہما کی ممبا دیوی سے ممبئی کے مستقبل کے خطرے سے واقف کرانا دراصل دور حاضر کی طرف اشارہ ہے جس میں وقتاً فوقتاً کئی برسوں سے ممبئی میں حملے ہوتے رہے ہیں۔ ناول میں ممبئی کی فٹ پاتھ کی زندگی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور اس فٹ پاتھ پر رہنے والے لوگ کس طرح جنس میں مبتلا ہیں اس کی مثال اس بھکارن لڑکی سے ملتی ہے جو حنا اور ودی سے کہتی ہے کہ اس کا باپ کئی برسوں سے اس کا جنسی استحصال کرتا آرہا ہے اور اس کی ماں کسی دوسرے مرد کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہاں قاری کی روح

لرز جاتی ہے اور ایک ایسے مقام پر قاری کو لے جاتی ہے جہاں اسے ممبئی کی چکا چوند زندگی میں انسان کا وجود ختم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے ساتھ ہی ،اس ناول میں ذات پات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح اکیسویں صدی میں بھی ابھی کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں ایک برہمن ، نچلی ذات والے کے ساتھ شادی نہیں کرسکتا ہے۔ ناول میں بے شمار واقعات ہیں لیکن ہر واقعہ آخر میں مرد اور عورت کے اس جسمانی رشتے پر ختم ہوتا ہے جس کی پایۂ تکمیل کے لئے پورے ناول میں ہر کردار ہر کسی کے ساتھ بے وفائی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب اسرار اس پر غور کرتا ہے تو اس پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن جب وہ خود کو ٹٹولنا شروع کرتا ہے اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس بے وفائی کا برابر کا شریک ہے اور بالآخر یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ بے وفائی انسان کی فطرت میں ہے بلکہ فطرت کا سب سے اہم عنصر ہے۔

یہ ناول ایک طرح سے نفسیاتی ناول بھی ہے لیکن مصنف نے جس کردار کی بھی نفسیات کا جائزہ پیش کیا ہے اس میں جنسی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ دراصل یہ ناول نفسیات سے ہوتے ہوئے جنس پر ختم ہوتا ہے دیگر واقعات کی طرح یہاں بھی جب نفس کو ٹٹولا جاتا ہے تو رحمٰن عباس کی نظر جنس پر پڑتی ہے۔

پروفیسر عبدالسلام اپنی کتاب عصمت چغتائی اورنفسیاتی ناول میں یوں رقمطراز ہیں:

”جس کے دل میں نفسیاتی گرہیں ہوں گی اس کی نظر دنیا کی

تمام باتوں کو چھوڑ کر جنس ہی پر پڑے گی ۔جس طرح ارجن کے
بھائیوں کو تو درخت پر پتے شاخیں وغیرہ تمام چیزیں نظر آئی تھیں مگر
ارجن کو صرف چڑیا دکھائی دی تھی۔اس طرح انسانی فطرت کی تمام
خصوصیات کو چھوڑ کر عصمت کی نظر بھی سب سے پہلے جنسی جذبہ ہی
پر پڑتی ہے۔''۵۹؎

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رحمٰن عباس کا یہ ناول اکیسویں صدی کا اہم ناول ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے متنازعہ بھی ہے لیکن اگر ناول کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ رحمٰن عباس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے ہی سماج کا حصہ ہے اور اس نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جو ہمارے اردگرد موجود نہ ہو اور موجودہ معاشرے میں اس طرح کے واقعات در پردہ موجود ہیں لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان واقعات اور حالات کو کھل کر اظہار کا جامہ پہنایا۔ ناول پلاٹ، موضوع ،منظر نگاری ، جزئیات نگاری،اسلوب کے اعتبار سے بھی کامیاب ہے ۔ ناول فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا اور مختلف مقامات پر ناول ماضی ، حال اور مستقبل میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کا رشتہ ہر جگہ استوار رکھا ہے۔اس میں کوئی شک نہیں کہ زیر بحث ناول، ناول کے میدان میں ایک اہم اضافہ ہے بقول گوپی چند نارنگ 'روحزن اردو ناول نگاری میں ایک اہم موڑ ہے۔دراصل یہ وہی موڑ ہے جس نے نہ

صرف ناول کو نئی سمت بخشی بلکہ مصنف کو بھی ایک نئی بلندی سے روشناس کرایا اس ناول پر گفتگو کرتے ہوئے فاضل جمیلی لکھتے ہیں۔''روحزن سے گزرے بغیر اردو ناول کے تجریدی ارتقاء کو سمجھنا اور ناول نگاری کے نئے معیارات کا تعین انتہائی مشکل ہے۔'' دراصل یہ ناول ''ناول کے میدان میں ایک اہم اضافہ ہے جو ابھی اگرچہ ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بنا ہوا ہے لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ یہ ناول انسان کو اپنے سماج کے بندھے ٹکے اصول سے باہر نکالنے کی ایک کوشش ہے بقول صلاح الدین۔''روحزن آدمی کو تہذیبی، ثقافتی اور مذہبی شناخت کے شکنجے سے باہر نکالنے کی کوشش ہے۔''

زندیق

''زندیق''، رحمٰن عباس کا تازہ ترین ناول ہے۔یہ ناول 2022ء میں منظر عام پر آیا۔ یہ ناول 786 صفحات پر مشتمل ہے۔رحمٰن عباس کے دوسرے ناولوں کی طرح یہ ناول بھی محبت، جنس اور مذہب کے گرد طواف کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن دوسرے ناولوں کے مقابلے میں اس ناول کا کینوس بہت وسیع ہے دراصل یہ ناول برصغیر کی سیاسی، سماجی، مذہبی اور تہذیبی زندگی کا آئینہ ہے جس میں زندگی کو مختلف رنگوں میں دیکھا جا سکتا ہے۔ناول کا پلاٹ کافی پھیلا ہوا ہے جس میں کرداروں کی بھرمار نظر آتی ہے۔ یہ ناول مذہبی انتہا پسندی کے تناظر میں لکھا گیا ہے اس ناول پر بات کرتے ہوئے پروفیسر شافع قدوائی یوں رقمطراز ہیں:

''یہ پہلا ناول ہے جس میں ہندوستان ، پاکستان اور جرمنی
کی معاصر سیاسی اور ثقافتی صورتحال کو ماضی قریب کی خون چکاں
داستان کی وسیع تناظر میں منعکس کیا گیا ہے یہ دنیا مذہبی انتہا پسندی
،ثقافتی جبر اور تکثیریت کا ہر نشان مٹانے کی پیہم کوششوں سے اپنی
صورت پکڑتی ہے۔ سامی مذاہب ،مذہب کی ادارہ جاتی تعبیر اور
بے لچک نقطہ نظر سے انکاری ہندو دھرم کی سیاسی تعبیر اور بدترین تنگ
نظری اور شدید تعصب کو روا رکھنے میں ان سے کسی طرح کم نہیں رہی
ہے مطلق سچائی کے دعویداروں نے عرصہ حیات تنگ کر دیا ہے ۔یہ
کائنات ہماری توقعات سے کہیں زیادہ خراب ہو چکی ہے اور رحمٰن
عباس کا ناول اس اجمال کی فنی تفصیل ہمارے سامنے پیش کرتا
ہے۔'' ۶۰

کہانی کے شروع میں ناول کا مرکزی کردار ثناء اللہ کمیشن افیسر بننے کے لیے دہرادون چلا جاتا ہے جہاں راستے میں اس کی ملاقات انیتا سے ہوتی ہے اس کے بعد عارفہ سے بھی ملاقات ہوتی ہے۔ ثنا اللہ اور مقبول بھٹ کی ملاقات ایک شوروم کی تقریب کے دوران ہوتی ہے جہاں فلم اور سیکس ڈول پر کھل کر اظہار سننے کے بعد مقبول بٹ اس طرح کی چیزوں کو قیامت کی نشانی قرار دیتا ہے وہیں دوسری طرف جب LGBTQIA کے حق میں سپریم کورٹ فیصلہ دیتی ہے تو کرناٹک اور بہار

جیسی ریاستوں میں ان پر قاتلانہ حملہ ہوتا ہے اس کے بعد ثنا اللہ کا تبادلہ لکھنو ہو جاتا ہے جہاں اسے شہناز اور عارفہ سے گزاری ہوئی رات یاد آتی ہے کچھ عرصہ بعد اس کا تبادلہ سری نگر ہوتا ہے جہاں دہشت گردوں کے ساتھ لڑائی میں ثنا اللہ ایک دہشت گرد کو مار گراتا ہے ثنا اللہ کا تبادلہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں ہوتا ہے انہوں نے ہماچل میں کتابوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور خود جہاد کے خلاف ایک کتاب لکھ ڈالی ۔ثنا اللہ کا تبادلہ جب لداخ کے لیے ہوتا ہے تو پہلے اس کی ملاقات دیشمکھ سے ہوتی ہے جو اسے مسلمانوں کے متعلق یہ خبر دیتا ہے کہ ہندوستان میں بھی ایسی ہی آئیڈیالوجی کو جنم دیا جا رہا ہے جو مسلمانوں کو ختم کرنے کے حق میں ہے یعنی جس طرح سے جرمنی سے یہودیوں کا ، پاکستان سے ہندوؤں کا خاتمہ ہوا اسی طرح ہندوستان سے بھی مسلمانوں کا خاتمہ کرنے کی سازش رچی جا رہی ہے دھیرے دھیرے ثنا اللہ جہاد کے معنی کو نئے پس منظر میں سمجھانے کی کوشش کرنے لگتا ہے ثنا اللہ کو یورپ جانے کے لیے حکم آتا ہے جہاں وہ ہولو کاسٹ کے پس پشت کی حقیقت کا پتہ لگا سکے ساتھ ہی نسل کشی کے سب سے المیائی باب کا بھی خلاصہ کرے ۔ثنا اللہ کے ساتھ ہندوراشٹر کے دو لوگ بھی جاتے ہیں جرمنی میں مارک اور کاربن ثنا اللہ کو اس نسل کشی کے ہر پہلو سے واقف کرتے ہیں ساتھ ہی برصغیر میں ہونے والے اقلیتوں پر مظالم کو بھی زیر بحث لایا جاتا ہے ۔یورپ میں ہی ثنا اللہ مختلف قسم کے جنسی آلات دیکھتا ہے جنہیں مرد اور عورت استعمال میں لا سکتے ہیں

یورپ سے لوٹنے کے بعد ثنا اللہ اپنی بیوی شہناز اور بیٹے نظار کے ساتھ دہلی جاتا ہے اس کے بعد کشمیر اور پھر لداخ ،اس طرح ثنا اللہ اپنے وطن کے لیے ہر سرحد پر جنگ لڑتا ہوآنظر اتا ہے ساتھ ہی ان تمام عناصر کو بھی سمجھنے کی کوشش کرتا ہے جو برصغیر میں پنپ رہے ہوتے ہیں۔ناول میں مختلف مذاہب سے جڑے ہوئے واقعات کا بیا کیا گیا ہے،اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف اسلام کے علاوہ بھی باقی کئی مذاہب کا علم رکھتے ہیں ۔ان تمام واقعات میں ثناء اللہ ہیرو کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے:

> ''ناول نگار نے اسلام اور ہندومت کے علاوہ بھی دیگر مذاہب کے متنازعات کا گہرا مطالعہ کیا ہے اور مخالفتوں اور مماثلتوں کی روشنی میں انسان کے مذہبی رنگ میں منقسم ہونے پر ڈھیر سارے سوالات اٹھائے ہیں۔ثنا اللہ ناول کا ایک ہیرو یک کردار ہے۔راوی نے بیانیہ کی تشکیل اس کے کارناموں سے کی ہے۔ ناول میں درجنوں مقامات ایسے آئے ہیں جن کی موجودگی سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول Epic diamension سے مملو ہے۔ اردو کے بعض ناقدین نے ایسے نشانات قراۃ العین حیدر کے نالوں میں دیکھے ہیں۔''۱۶

ناول'' زندیق''طویل ہونے کے سبب بے حد پیچیدہ نظر آتا ہے۔کہانی کا

پلاٹ سیاسی اور مذہبی کشمکش سے اُبھرنے والی کشیدگی سے تیار کیا گیا ہے۔ناول میں کرداروں کی کثیر تعداد نظر آتی ہے جو پوری دنیا میں بڑھ رہی نسلی برتری اور مذہبی انتہا پسندی پر گفتگو کرتے ہوئے نظر اتے ہیں دراصل رحمٰن عباس کا یہ ناول برصغیر کی سیاسی اور مذہبی زندگی کا ایک المیہ ہے جس میں یورپ بالخصوص جرمنی کے اس المناک واقعے کے پس منظر میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان میں بھی نازی جیسے حالات پیدا ہورہے ہیں جس کا سب سے بڑا ثبوت کچھ عرصہ سے اقلیتی طبقے پر ہونے والے مظالم ہیں یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا لازمی ہے کہ یہ ناول کسی ایک ملک کی مذہبی انتہا پسندی اور نسلی برتری پر طنز نہیں ہے بلکہ برصغیر کے ان تمام ممالک پر گہرا طنز ہے جو نسلی برتری اور مذہبی انتہا پسندی کو فروغ دے رہے ہیں۔ثناء اللہ ناول میں دیگر کرداروں کے ساتھ گفتگو کے دوران اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں کہ یہ استحصال اور مظالم کسی بڑے خطرے کا پتہ دیتے ہیں دراصل ناول میں پاکستان، بنگلہ دیش، بھارت اور دیگر ممالک میں جس طرح نسلی برتری کا تصور اُبھر رہا ہے وہ جرمنی کی طرح ہی نسل کشی کی طرف اشارہ کرتا ہے یہاں نہ صرف ہندوستان میں رہنے والے اقلیتوں پر ہو رہے ظلم کو ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے بلکہ پاکستان میں جو احمدیہ کے ساتھ ہوتا ہے اس کا بھی اظہار ہے۔ناول نگار نے وجود، آدمی اور تنہائی پر بھی گفتگو کی ہے اتنا ہی نہیں انہوں نے میراں جی کی نظموں کے بہت سے بند بھی ناول میں شامل کیئے ہیں لیکن مصنف

کا کمال یہ کہ یہ بیانیہ کا اٹوٹ حصہ معلوم ہوتے ہیں۔اس ضمن میں مقصود دانش یوں رقمطراز ہیں:

''ناول نگار نے آدمی اور وجود کے تعلق سے بھی مباحث قائم کیے ہیں۔ دنیا کے تمام بڑے ناولوں میں قصہ، کہانی قاری گرفت میں رکھنے کے وسیلے میں ناول نگار حیات وکائنات کی اصلیت کو سمجھنے اور سمجھانے کی فنکارانہ ت جتن کرتا ہے۔حیات وکائنات سے متعلق ہزاروں نظریات قائم ہو چکے ہیں اور سب ایک دوسرے کے مخالف ،ایسی صورت میں ناول ہی ایک ایسا وسیلہ ہے جس کے ذریعے دنیا کی نیرنگیوں کو بہتر طور پر سمجھا جا سکتا ہے۔ زندیق کے ناول نگار نے ان فضاؤں کو سمجھنے کے لیے وہ مفکرین سے مدد لینے کے بجائے شعرو ادب سے کام لیا ہے میرا ان جی کم عمری میں رخصت ہو گئے لیکن حیات وکائنات کی باطنیت جس طرح ان پر منکشف تھی شاید اور کسی شاعر پر نہ ہو سکی ۔ناول نگار نے میرا جی کے بعض نظمیہ اقتباسات کو بیانیہ میں ایسے پیوست کیا ہے کہ گویا وہ بھی متن کے اٹوٹ حصے ہوں۔''۶۲

ناول میں ثناء اللہ کا کردار مرکزی حیثیت رکھتا ہے یہ کردار فوج میں افسر کی حیثیت سے تعینات ہوتا ہے لیکن اپنی سوجھ بوجھ اور قابلیت کے بنا پر یہ بہت جلدی

نام کما لیتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسے یورپ بھی بھیجا جاتا ہے یہ کردار جہاد کی بنیادی مفہوم سے بھی روشناس کرانے کی کوشش کرتا ہے ساتھ ہی ان پانچ احادیث کا بھی ذکر کرتا ہے جن کو مطلب کے لیے غزوہ ہند کے ساتھ جوڑا جاتا ہے لیکن ثنا اللہ ان احادیث اور غزوہ ہند کی کچھ اور تشریح کرتا ہے یہ کردار مذہبی انتہا پسندی کے سخت خلاف نظر آتا ہے یہی وجہ ہے کہ یہ کردار عصر حاضر کی صورتحال کو دیکھ مستقبل کے خدشات سے آگاہ کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے پچھلی چند دہائیوں سے جو منفی تصورات ہمارے معاشرے میں ابھرنے کی کوشش کر رہے ہیں ان پر گہری چوٹ کی ہے یہاں ہندوراشٹر کے حق میں اٹھنے والی آوازوں کی بھی گونج کو صاف سنا جا سکتا ہے ساتھ ہی ان آوازوں کے پس پشت کی حقیقت کو بھی مصنف نے ثنا اللہ کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ مصنف نے بڑی باریکی کے ساتھ ہر ایک پہلو پر گفتگو کی ہے۔

ناول میں جہاں نسلی برتری، قومیت کا تصور اور مذہبی انتہا پسندی نظر آتی ہے وہیں دوسری طرف عصر حاضر کی بدلتی ہوئی زندگی کو بھی صاف دیکھا جا سکتا ہے معاشرے میں جس طریقے سے LGBTQIA جیسے طبقوں کو سپریم کورٹ کی طرف سے ہری جھنڈی ملتی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مساوات کا تصور بھی ایک نئی شکل کے ساتھ سامنے آیا ہے وہیں جنسی تسکین کے لیے بھی بازار میں جس طرح سے جنسی آلہ دستیاب ہیں وہ زندگی کو ایک نئی راہ کی اور لے جا رہا ہے یہاں

مذہب اور لبرل ازم کا تصادم بھی نظر آتا ہے اور اس تصادم کا اہم کردار مقبول بٹ کی صورت میں نظر آتا ہے جس کا تعلق کشمیر سے ہوتا ہے جو جنسی آلات پر کھل کر بات کرنے کو قیامت کی نشانی سمجھتا ہے وہیں دوسری طرف مصنف مقبول بٹ جیسے کرداروں کے ذریعے مذہبی انتہا پسندی کی سوچ کو بھی سامنے لاتا ہے، یہ ناول بدلتے ہوئے معاشرے کی بھی ترجمانی کرتا ہے اور عصر حاضر کے سنگین مسائل کی بھی جو اس وقت نہ صرف ہندوستان بلکہ پورے برصغیر کو اپنے لپیٹے میں لیے ہوئے ہیں اس کا سب سے بڑا ثبوت ہندوستان پاکستان اور بنگلہ دیش جیسے ملکوں میں اقلیتی طبقوں پر ہونے والے دہشت گردانہ حملے ہیں جو گذشتہ ایک صدی سے زیادہ بڑھ رہے ہیں۔ یہ ناول انسانی وجود کو مذہب کے آئینے میں پیش کرتا ہے جو اپنے وجود کو بچانے کے لیے کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہے یہاں گہرا تذبذب نظر آتا ہے جو ایک طرف اپنی شناخت کو لے کر نظر آتا ہے تو دوسری طرف ان فیصلوں کے خلاف بھی دکھائی دیتا ہے جو مذہب کے خلاف ہوتے ہیں دراصل اسلام میں ہم جنسی اور جنسی آلات کو لے کر سخت ممانعت ہے لیکن جس طریقے سے عالمی سطح پر عدالتیں اس طرح کے طبقوں کو قبول کر رہی ہے ایسے میں اسلام کے ماننے والے کھل کر اس نظام کی مخالفت کرتے ہیں جس کے سبب دھیرے دھیرے ایک کشیدگی جنم لے رہی ہے جس کا انجام اچھا معلوم نہیں ہوتا ہے:

''اگر یہ کہا جائے کہ ناول زندیق کا زمانہ عرصہ ہزاروں

ہزار ہا سال پر مشتمل ہے تو غلط نہ ہوگا ،شمس الرحمٰن فاروقی اور احمد
جاوید صاحبان نے ناول'' آگ کا دریا'' میں موجود اس درجے کی نثر
کے باوجود ناول کی ادبی اہمیت سے انکارنہیں کیا ہے۔ ناول زندیق
کی نثر میں بھی مذکورہ کمیوں کا احساس ہوتا ہے لیکن اس کی ادبی وفکری
اہمیت سے انکارنہیں کیا جا سکتا مثلا ہٹلر کی نازی ازم، جرمن میں
وقوع پذیر سانحات، 2002 کا گجرات سانحہ، شاہین باغ احتجاج کو
ختم کرنے کی زعفرانی سیاست وغیرہ اس ناول میں بھی کسی مخصوص
تاریخی یا جغرافیائی صورتحال کو ناول نگار از سر نو بڑی خوبی سے خلق کر
لیتا ہے لیکن جب مصنف بیان کرنے پر آمادہ ہوتا ہے تو عجلت پسندی
کا شکار ہو جاتا ہے یا تھوڑا جذباتی ہو جاتا ہے تو کرشن چندر کی سجی
سنوری نثر اس سے فاصلہ اختیار کر لیتی ہے لیکن جیسے کہ فاروقی
صاحب نے مصنفہ اور ناول کی اہمیت سے انکارنہیں کیا ہے اسی طرح
زیر نظر ناول کے مصنف کی اس فنی رویے کی سراہنا ضروری ہے۔
اردو فکشن کی نثر کو ایک نئی فضا عطا کرنے کی انہوں نے پہل کی ہے
جس کی طرف شافع قدوائی نے بھی اشارہ کیا ہے۔''۶۳

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رحمٰن عباس کا یہ ناول طوالت کے اعتبار سے
قاری کو بوجھل کر دیتا ہے ساتھ ہی ناول میں مختلف واقعات کی بھرمار نظر آتی ہے یہ

واقعات معلوماتی ہیں جن میں موجودہ منظر نامے کو تاریخ کے ائینے میں دیکھنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ناول ان فسطائی طاقتوں پر بھی طنز ہے جو دھیرے دھیرے اپنی جڑیں مضبوط کرتی جا رہی ہیں لیکن دوسری طرف باشعور سماجی طبقے کے لیے ایک اشارہ بھی ہے جو برصغیر میں پنپنے والے ان عناصر کی طرف دھیان دلاتا ہے جو مذہبی انتہا پسندی اور نسلی برتری کی آئیڈیالوجی کو بڑھاوا دے رہے ہیں یہ ناول بے حد معلوماتی اور زبان و بیان کے اعتبار سے اردو کا کامیاب ناول ہے:

> ''رحمٰن عباس کا ناول زندیق موضوعاتی اور اسلوبیاتی طور پر بالکل ایک نئ دنیا کی طرف لے جاتا ہے اگر یہ کہا جائے کہ اردو ناول کے صد سالہ سفر میں ایک ناول بھی ایسا نہیں لکھا گیا جس کی بنیاد فاشزم پر رکھی گئی ہوتو غلط نہ ہوگا با الفاظ دیگر یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اردو میں اب تک ایسا ناول تخلیق نہیں کیا گیا جس کی تخلیقی تاروں کود میں فاشزم کی زیادہ سے زیادہ شراکت داری رہی ہو''۔۶۴؎

حوالہ جات

۱۔ اردو ناول نگاری، سہیل بخاری، الحمر پبلشرز، دہلی، ۱۹۷۲، صفحہ نمبر ۱۶

۲۔ اکیسویں صدی میں اردو ناول، ڈاکٹر نعیم انیس، ڈاکٹر عمر غزالی، ۲۰۱۶ صفحہ نمبر ۱۹۰، ۱۹۱

۳۔ نخلستان کی تلاش میں، رحمٰن عباس، خزانہ پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۰۴، ص،

۴۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یضاً، ص نمبر ۵۵

۵۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یضاً، ص نمبر ۸۷

۶۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یضاً، ص نمبر ۳۱

۷۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یضاً، ص نمبر ۹۹

۸۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یضاً، ص نمبر ۱۲۱

۹۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یضاً، ص نمبر ۱۱۳

۱۰۔ ایک ممنوعہ محبت کی کہانی، رحمٰن عباس، ایجوکیشنل پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۰۹،

۱۱۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یضاً، ص نمبر ۹۸

۱۲۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔یضاً، ص نمبر ۵۶

۱۳۔ رحمٰن عباس کی ناول نگاری کا تنقیدی جائزہ، ڈاکٹر عمر غزالی، ص، ۱۹۹

۱۴۔ ایک ممنوعہ محبت کی کہانی، رحمٰن عباس، ایجوکیشنل پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۰۹، ص ۱۱۰

۱۵۔ اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید، علی عباس حسینی، ص نمبر۔ ۶۶

۱۶۔ ایک ممنوعہ محبت کی کہانی، رحمٰن عباس، ایجوکیشنل پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۰۹، ص ۹

۱۷۔ ایک ممنوعہ محبت کی کہانی، رحمٰن عباس، ایجوکیشنل پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۰۹، ص ۱۴۹

۱۸۔ خدا کے سائے میں آنکھ مچولی، رحمٰن عباس، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۱، ص

۱۹۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً، ص نمبر۔ ۱۱۲

۲۰۔ ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ایضاً، ص نمبر۔ ۶۷

۲۱۔ ------------ایضاً،ص نمبر۵

۲۲۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۴۴۴

۲۳۔ ------------ایضاً،ص نمبر۴۴۱

۲۴۔ عتیق احمد، مضامین پریم چند، سن اشاعت ۱۹۸۱ء۔ص، ۲۰۹

۲۵۔ خدا کے سائے میں آنکھ مچولی، رحمٰن عباس، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۱، ص، ۱۴۴

۲۶۔ خدا کے سائے میں آنکھ مچولی، رحمٰن عباس، عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۱۱، ص ۱۹۹

۲۷۔ رحمٰن عباس، روحزن، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص نمبر۔۳۵۵

۲۸۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۳۸

۲۹۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۱۳۱

۳۰۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۱۷۷

۳۱۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۳۶۳

۳۲۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۳۵۴

۳۳۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۱۱۶

۳۴۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۱۱۷

۳۵۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۹۰

۳۶۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۱۰۳

۳۷۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۳۵۳،۳۵۴

۳۸۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۳۶

۳۹۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۹۱

۴۰۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۲۰۹

۴۱۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۱۷۶،۱۷۷

۴۲۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۱۸۳

۴۳۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۲۴۵

۴۴۔ ------------ایضاً،ص نمبر۔۱۱۶

۴۵۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔۳۶،۳۷

۴۶۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔۱۲۹

۴۷۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔۵۶،۵۷

۴۸۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔۲۸۵

۴۹۔ علی عباس حسینی۔اُردو ناول کی تاریخ اور تنقید،ص نمبر۔۶۶

۵۰۔ رحمٰن عباس،روحزن،عرشیہ پبلی کیشنز دہلی،ص نمبر۔۱۱

۵۱۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔۳۵۳،۳۵۴

۵۲۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔۴۳،۴۲

۵۳۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔ ۲۹

۵۴۔ اطہر پرویز،ادب کا مطالعہ،ص نمبر۔۸۹

۵۵۔ رحمٰن عباس،روحزن،عرشیہ پبلی کیشنز دہلی ص نمبر۔۱۹۸

۵۶۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔۲۱۲

۵۷۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔۲۲۲

۵۸۔ ــــــــــــــــــــ۔ایضاً،ص نمبر۔۲۲۷

۵۹۔ پروفیسر عبدل السلام،عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول،دریا گنج،نئی دہلی،۱۹۸۹ص نمبر۱

۶۰۔ اردو ناول کی نئی دنیا: زندیق،مقصود دانش،مقدمہ،شافع قدوائی،عرشیہ پبلی کیشنز دہلی،۲۰۲۳،ص،۱۵

۶۱۔ اردو ناول کی نئی دنیا: زندیق،مقصود دانش،عرشیہ پبلی کیشنز نئی دہلی،ص،۴۵

۶۲۔ ایضاًــــــــــــــــــــ۔ص،۳۴

۶۳۔ ایضاًــــــــــــــــــــ۔ص،۱۲۳،۱۲۴

۶۴۔ ایضاًــــــــــــــــــــ۔ص،۲۰۲۳،۲۹

معنوں میں ایک عظیم شخصیت ہیں جنہوں نے ہندوستان کی سیاسی اورسماجی زندگی پر کئی کتابیں لکھیں ان میں'' دھرم راج '' نامی کتاب اہمیت کے حامل ہے دراصل انہیں سیاست کے بجائے اس چیز میں زیادہ دلچسپی ہے کہ ہندوستان کے غریب طبقے کو کیسے اوپر اٹھایا جائے ان کے تحقیقی کام اس ضمن میں قابل تعریف ہیں۔ انہوں نے غریب کسان اور پچھڑے طبقوں کے لیے جو کچھ بھی کیا اور جو سجھاؤ دیے ان سے بہت سے مسائل کو حل کرنے میں مدد ملتی ہے۔ زندگی کے متعلق ان کی سوچ مثبت نظر آتی ہے ساتھ ہی ان کی کتابیں، پڑھنے والوں میں ایک نیا حوصلہ پیدا کرتی ہیں:

''جو کچھ میں نے کر دکھایا وہ کوئی بھی نوجوان کرسکتا ہے اس کے لیے پیسوں کی ضرورت نہیں ہے اور نہ ہی برسر اقتدار لوگوں کی پشت پناہی کی ضرورت ہے یہی نہیں اس کے لیے کسی غیر معمولی ذہانت کی بھی ضرورت نہیں ہے یہ سب میری زندگی کے سفر نے مجھے سکھایا ہے ایک مثالی اور خوشحال زندگی جینے کے لیے قدرت کے فیصلوں اور اپنے ارادوں کے تال میل کو سمجھنا ضروری ہے یہ تال میل اگر صحیح رہا تو ایک صحیح سمت مل ہی جاتی ہے اس سمت پر سفر کرتے ہوئے کامیابی یا ناکامیابی جیسی معمولی باتوں کو ذہن میں نہ لاتے ہوئے صرف اچھے برے نتائج کا خیال رکھتے ہوئے قدم اٹھایا جائے تو کوئی بھی نوجوان فلک پر کمند ڈال سکتا ہے اگر سارے ہی نوجوان

ایک سمت کی تلاش میں قدم اٹھائیں تو ہمیں اور ہمارے ملک کو بھی
ایک سمت ضرور مل جائے گی ۔پہلی جماعت میں مجھے پڑھایا گیا تھا
کہ قطرہ قطرہ دریا بنتا ہے اپنی سماج کی حالت بھی وہی ہے ایک ایک
نوجوان اگر قدرت کے فیصلوں کے ساتھ اپنے ارادوں کو جوڑنا
شروع کرے تو بہت جلد ایک خوشحال اور ترقی یافتہ ملک وجود میں
آجائے گا اس میں کوئی شک نہیں ۔''۹

رحمٰن عباس نے ناول کی تنقید کے حوالے سے بھی کتابیں لکھی ہیں۔ ناول کی تنقید کے حوالے سے ان کی اب تک دو کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں جن میں انہوں نے نئے لکھے گئے ناولوں پر گفتگو کی ہے ساتھ ہی ناول کے بدلتے ہوئے رویوں پر بھی معلوماتی بحث کی ہے۔ان کی پہلی تنقیدی کتاب ''اکیسویں صدی کی دہلیز پر اہم اردو ناول'' ہے ۔ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ اس کتاب میں جتنے بھی مضامین شامل ہیں وہ ساہتیہ اکیڈمی کے سیمیناروں میں پڑھے گئے تھے اس کا پہلا سیمینار 2012 کو دہلی میں منعقد ہوا تھا اور دوسرا سیمینار 2018 کو بنگلور میں منعقد ہوا تھا ہ۔ان دونوں سیمیناروں میں اردو کے بڑے مایہ ناز ادیبوں نے مقالے پڑے تھے اور یہ مقالے بالخصوص ناول کے حوالے سے تھے۔ یہ مقالے اکیسویں صدی میں اردو ناول کے منظر نامے کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں ۔ رحمٰن عباس کا ماننا ہے کہ ناول کے فن پر بہت کم لکھا گیا ہے اور جو کچھ لکھا گیا ہے وہ اتنا

سنجیدہ نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اس کتاب میں ان مضامین کو شامل کیا ہے جو ناول کے آرٹ، ناول کے مسائل اور ناول کی ارتقاء کے حوالے سے اہم ہیں۔ اس ضمن میں مصنف یوں رقم طراز ہیں:

''ناول کے فن پر اردو میں اچھے مضامین کم ہیں اور عہد حاضر میں میری نگاہ میں کوئی سنجیدہ مضمون لکھا نہیں گیا ہے چنانچہ پروفیسر گوپی چند نارنگ، نظام صدیقی اور وارث علوی کے مضامین شامل کیے ہیں۔ نظام صدیقی اور وارث علوی کے مضامین ناول کے آرٹ کی اہمیت، مغربی ناول کی مختصر تاریخ، اردو ناول کے مسائل، اردو ناول کے ارتقاء اور سماجی اور معاشرتی زندگی میں ناول کی ضرورت پر دلیل ہیں دوسری طرف گوپی چند نارنگ کا مضمون پرانوں کی اہمیت اس لیے بھی اہم ہے کہ ناول کے مطالعے میں اصنام، استوریا متھ اور ان سے وابستہ تاریک حکایات اور فلسفیانہ اساس کی اہمیت ناول کے مطالعے کی بنیادی شرط ہے۔''[۱۰]

اس تصنیف کا پہلا مضمون وارث علوی کا ہے جس کا عنوان'' ناول بن جینا کوئی جینا ہے''۔ یہ مضمون ناول کی تکنیک ،ہئیت ،اسلوب ،موضوع اور بدلتے ہوئے منظر نامے پر روشنی ڈالتا ہے۔ یہاں مصنف نے بڑی باریکی سے کہانی لکھنے کے فن کو بیان کیا ہے لیکن اکیسویں صدی میں ناول جس طریقے سے سامنے آ رہا ہے

اسے دیکھ کر مایوسی ہوتی ہے دراصل مصنف ناول کو ان تمام جکڑ بندیوں سے آزاد دیکھنا چاہتا ہے جہاں لفظی چٹخارے کے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا ہے اور اس پر سب سے زیادہ منفی اثرات علامتی اور استعاراتی انداز نے ڈالے جہاں کہانی کا تعلق زندگی سے ٹوٹ کر محض شعبد بازی ہو کر رہ گیا، اس میں اتنا الجھاؤ پیدا ہو گیا کہ کہانی کی اصل روح کہیں دفن ہو گئی یہی وجہ ہے کہ دوسرے زبانوں کے برعکس اردو ناول میں وہ تمام موضوعات عنقا ہو گئے ہیں جو بدلتی ہوئی زندگی کا حصہ ہیں ۔عصر حاضر میں انسانی زندگی جن مسائل سے دوچار ہے اور انسان اپنے وجود کو بچانے کے لیے جس طرح تذبذب کا شکار ہے اس کی ترجمانی کہانی میں کہیں بھی نظر نہیں اتی ہے وارث علوی کو جن ناولوں کی تلاش ہے وہ ناپید ہیں:

''مجھے تلاش ہے ان ناولوں کی جن کی دنیاؤں میں کھو کر آدمی
خود کو پاتا تھا مجھے پتہ نہیں ان پچاس سالوں میں اُردو والے کون سے
ناول، افسانے اور رمضامین پڑھتے رہے ہیں۔''[۱۱]

وارث علوی اس مضمون میں عالمی سطح کے ناولوں کا حوالہ دیتے ہیں جہاں ہر ناول دوسرے ناول سے مختلف اور اچھا ہوتا ہے۔ یہ ناول نہ صرف موضوعاتی اعتبار سے بلکہ انداز بیان کے حوالے سے بھی قدر مختلف ہوتے ہیں اور ان ناولوں میں سلیس، رواں اور دلآویز نثر دیکھنے کو ملتی ہے جو قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کراتی ہے ۔ یہاں کہانی کو مبہم اور تجریدی بنا کر پیش نہیں کیا جاتا ہے بلکہ کہانی، انسان کی

پیچیدہ زندگی کا اظہار سادہ اور سلیس انداز میں کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہاں فرد کی تنہائی، ذات ،اجنبیت ،تذبذب اور آزاد جنسی تعلقات جیسے موضوعات بہترین انداز میں نظر آتے ہیں لیکن وہیں دوسری طرف اردو ناول کا میدان مایوس کن نظر آتا ہے:

''میرے کچھ خواب نہ سہی کچھ خوف ضرور ہیں مجھے خوف آتا ہے اس وقت سے جب مجھے ایسی دنیا میں جینا پڑے جہاں پڑھنے کے لیے ناول نہ ہو مجھے ہول آتا ہے اردو فکشن کے جدید منظر نامے کو دیکھ کر جس میں نظریات کی پلاسٹک کی تھیلیاں چاروں طرف بکھری پڑی ہیں اور ایک لنڈ منڈ درخت پر افسانہ اپنی بے بال و پری پر نوحہ کنا ہے۔جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے نمونوں کے طور پر جن ناولوں کے نام لیے جاتے ہیں وہ تو پیاسے کو حنظل پلانا ہے۔''[۱۲]

اس کتاب کا دوسرا اہم مضمون گوپی چند نارنگ کا ہے جس میں پرانوں کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے دراصل پران ہندو مذہب میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں ان پرانوں میں ہندوستان کی ہزاروں سالوں کی زندگی کا سراغ ملتا ہے یہاں قدیم ترین تہذیبی زندگی کی ترجمانی بھی انہی پرانوں سے دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ پران ہماری زندگی کا قیمتی اثاثہ ہے۔کہانی میں جو اساطیری روپ نظر آتا ہے اس کا ماخذ کہیں نہ کہیں یہی پران ہیں جن میں نہ جانے کتنے ہی معلوماتی قصے ہیں جن کی

کوکھ سے ہزاروں کہانیوں نے جنم لیا ہے ان پرانوں میں جتنی بھی کہانیاں ہیں وہ نسل درنسل چل کرآگے بڑھی ہیں اور ہر زمانے میں اس کی مختلف شکلیں نمودار ہوئی ہیں:

''بعد میں انہوں نے یہ کہانیاں ریشی جمینی کو سنائی یہ ایک دوسرے سے جڑی ہوئی یعنی کہانی در کہانی ہے ان کا مشترک عنصر کائنات کا ارتقائی تسلسل یا وقت کے لامتنائی سلسلے کا بیان ہے جو ہر زمانے میں نئے حالات میں نئی نئی شکلوں کے ساتھ ظاہر ہوتا رہا ہے''۔۱۳؎

رحمٰن عباس کی اس کتاب میں اور بھی کئی اہم معلوماتی مضامین شامل ہیں جن میں جدید ناول کے منظر نامہ پر کھل کر بحث کی گئی ہے اور ناول کی تخلیقیت ،فن اور اسلوب پر گفتگو کی گئی ہے۔ یہ تمام مضامین ناول کے ارتقاء میں اہم درجہ رکھتے ہیں ساتھ ہی اس سیمینار میں کچھ ناولوں کو بنیاد بنا کر ناول کی بدلتی ہوئی صورتحال کو پیش کیا گیا ہے یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ وارث علوی جس تشنگی کا ذکر کرتے ہیں، پچھلی تین دہائیوں میں کچھ ایسے ناول ضرور سامنے آئے ہیں جن میں تخلیقیت ، ندرت اور آرٹ کا بہترین امتزاج نظر آتا ہے اس ضمن میں ''خواب سراب''، ''کہانی کوئی سناؤ متاشا''، ''دھمک''، ''مہاماری'' اور ''مانجھی'' وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ نظام صدیقی نے اپنے مضمون میں ''خواب سراب'' کے حوالے سے بہت عمدہ مثالیں پیش کی ہیں کہ کس طرح یہ ناول ،ناول کے جدید منظر نامے میں

ایک اہم مقام رکھتا ہے۔ ''خواب سراب'' انیس اشفاق کا لکھا ہوا اہم ناول ہے جس میں نئی نسل کی کشیدگی کو صاف دیکھا جا سکتا ہے وہیں دوسری طرف وسیم بیگم نے نواب صادقہ سحر ے ناول'' کہانی کوئی سناؤ متاشا'' پر علمی گفتگو کی ہے،۔ یہ ناول بھی اکیسویں صدی کے اہم ناولوں میں شمار ہوتا ہے جس میں عورت کا تحفظ اور معاشرے میں اس کی پوزیشن کو بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے عورت جس استحصال کا شکار ہوتی ہے اس کا المیائی بیان ناول میں نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی جدید دور میں جس طریقے سے یہ عورت اپنے تحفظ کو لے کر لڑتی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ عورت نئی نسل کے لیے مشعل راہ ہے۔ ناول ''مانجھی'' بھی ان معنوں میں اہمیت کا حامل ہے کہ اس میں زبان ،تکنیک اور خوبصورت بیانیہ نظر آتا ہے۔ ''مانجھی'' غضنفر کا لکھا ہوا اہم ناول ہے جس میں مصنف نے دور حاضر کے معاشرے کی عکاسی کی ہے اس ناول میں درد ہے، کسک ہے،عورتوں کی آہ و بکا ہے، مردوں کے بدچلنی کے ساتھ ساتھ میڈیا کی بے سمتی بھی نظر آتی ہے اس ناول پر بات کرتے ہوئے نعیم انیس یوں رقم طراز ہیں:

> ''ناول مانجھی میں اعتدال پسندی ہر جگہ نمایاں ہے جو اس کی مقبولیت کا خاص ضامن ہے اگر اس میں عورت مظلوم اور مقہور نظر اتی ہے تو اس کی بہادری و چالاکی بھی اپنے جلوہ بکھیرتی ہے اگر اس میں عورتوں کے جسم کی نمائش کے تعلق سے مردوں کو قصوروار ٹھہرایا گیا

ہے تو عورتوں کی بے راہ روی بلکہ ہر کام کے لیے اس کی رضامندی
کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے‘‘۔[۱۴]

مختصر طور پر کہہ سکتے ہیں کہ رحمٰن عباس نے اپنی اس کتاب میں جن مضامین کو شامل کیا ہے ان سے دو چیزیں ابھر کر سامنے آتی ہیں ایک طرف ناول کی تنقید کے حوالے سے وہ مضامین ہیں جن میں ناول کی تخلیقیت کے حوالے سے بات کی گئی ہے اور ناول کے جدید منظر نامے کو ناول کے ارتقاء کے لیے ناکافی قرار دیا ہے اس ضمن میں وارث علوی، شافع قدوائی اور نظام صدیقی کے ایسے مضامین ہیں جن میں ناول کے آرٹ، اسلوب اور دیگر اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے وہیں دوسری طرف اکیسویں صدی کے کچھ اہم ناولوں کو بھی بیان کیا گیا ہے جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ناول کا مستقبل تاریکی میں نہیں ہے اس ضمن میں ’’روحزن‘‘، ’’مانجھی‘‘، ’’کہانی کوئی سناؤ متاشا‘‘ اور ’’دھمک‘‘ قابل تعریف ہیں۔ یہ وہ ناول ہیں جو ناول کی ارتقاء کا اہم حصہ ہیں اور جن میں موضوعاتی، تکنیک اور اسلوب کی سطح پر جدت نظر آتی ہے۔ یہ ناول دور حاضر کے مسائل کا احاطہ کرتے ہیں اس میں کوئی شک نہیں کہ عصر حاضر میں ناول کے لیے کافی چیلنجز ہیں لیکن نئے لکھنے والے جس انداز سے کہانی کا رشتہ زندگی سے جوڑنے میں لگے ہیں اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ناول کا مستقبل روشن ہے اور کہانی کا تعلق جب تک زندگی سے بنا رہے گا کہانی ہمیشہ زندہ رہے گی اس بات کی طرف وارث علوی اور گوپی چند نارنگ جیسے نقادوں نے بھی بار

بار توجہ دلائی ہے۔

ان کے تنقیدی مضامین کا دوسرا مجموعہ ''اکیسویں صدی میں اردو ناول اور دیگر مضامین'' کے عنوان سے ہے۔اس کتاب میں بھی رحمٰن عباس نے نئے لکھنے والوں پر روشنی ڈالی ہے بالخصوص اردو ناول پر کہ کس طرح عصر حاضر میں ناول زندگی کی ترجمانی کر رہا ہے یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ رحمٰن عباس خود بھی ناول نگار ہیں یہی وجہ ہے کہ ناول کی تنقید کے حوالے سے انہوں نے جو کچھ لکھا یا جو کچھ انہوں نے یکجا کر کے شائع کیا وہ ناول کے لیے اہم ہے لیکن رحمٰن عباس بھی وارث علوی کی طرح نئ صدی کے ناولوں سے مطمئن نہیں ہے:

''نئ صدی کی ابتدا سے تا حال جو ناول شائع ہوئے ہیں ان میں سے بیشتر کو پڑھ کر میں مطمئن نہیں ہوں کیونکہ یہ ناول حسن معنویت اور ندرت سے اس قدر محروم ہے کہ ان میں نہ کوئی کسی جہان دیگر کی سیر کر سکتا ہے اور نہ ہی ان کے مطالعے سے نئ روشنی ملتی ہے''۔۱۵؎

دراصل رحمٰن عباس کا ماننا ہے کہ نئے لکھنے والے کہانی کا تعلق زندگی سے تو استوار رکھتے ہیں لیکن آرٹ سے اس کا تعلق نظر نہیں آتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے نزدیک ناول صرف طویل کہانی بیان کرنے کا نام نہیں ہے بلکہ آرٹ کے تقاضوں کو پورا کرنے کا نام ناول ہے بلا شبہ اس صدی کو ناول کی صدی قرار دیا جا رہا ہے اور

کثیر تعداد میں لکھنے والوں کی فہرست سامنے آرہی ہے لیکن یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ ناول کا فن غائب ہوتا جارہا ہے اور نئے لکھنے والے موضوع پر توجہ صرف کررہے ہیں یہی وجہ ہے کہ بہترین ناول سامنے نہیں آرہے ہیں اس ضمن میں رحمٰن عباس لکھتے ہیں:

''نئی صدی میں جو ناول نگار سامنے آئے ہیں ان میں سے چند ایک ناولوں کو پڑھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اب اُردو ناول مذکورہ بالا ناقص فنی نظریات کو بڑی حد تک رد کرتا ہوا آگے بڑھ رہا ہے گزشتہ نصف صدی کی فکشن کی غیر صحت مند تنقید اور ناقدین کی جانبداری نے فنکار کو نقادوں کے چنگل سے نکلنے کا واضح پیغام دیا ہے اور فنکار اسے تسلیم کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔''[۱۶]

اکیسویں صدی میں اردو ناول، رحمٰن عباس، صفحہ، ۱۵۶

مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رحمٰن عباس نے ناول کی تنقید کے حوالے سے جو کچھ لکھا وہ ان کی بلند ذہانت کا عمدہ نمونہ ہے یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ انہوں نے ناول کی تنقید کے حوالے سے کوئی جامع یا مفصل کتاب نہیں لکھی ہے بلکہ انہوں نے مختلف ناقدین کے مضامین جمع کر کے انہیں کتابی صورت میں شائع کیا ہے، یہ مضامین مختلف سیمیناروں میں پڑھے گئے ہیں جنہیں یکجا کر کے رحمٰن عباس نے شائع کیا۔ یہ مضامین ناول کی تنقید کے حوالے سے ہیں۔انہوں نے ''ساجد

رشید‘‘ پر جو مونو گراف لکھا وہ حقیقی معنوں میں ان کی ایک کامیاب کوشش ہے ساتھ ہی ترجمے کے فن سے بھی واقف نظر آتے ہیں۔ انہوں نے ’’ایک سمت کی تلاش‘‘ میں ترجمے کا حق ادا کیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں دو عظیم شخصیات کی زندگی سے متعلق ہیں جن کے مطالعے کے بعد قاری ایک طرف نڈر، بے باک صحافی ، سماجی خدمت گار اور ادیب کی زندگی سے واقف ہوتا ہے تو دوسری طرف عالمی سطح پر جو پالیسیاں اپنائی جا رہی ہیں اور ان پالیسیوں کے تناظر میں ہمارا ملک کس دہانے پر کھڑا ہے اور اسے کن طریقوں سے ہم بہتر بنا سکتے ہیں اس کا علم بھی ہوتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ مونوگراف، ساجد رشید، رحمٰن عباس، پیش لفظ، ارتضی کریم، ص ۱

۲۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفحہ۳۴

۳۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص۳۸

۴۔ ساجد رشید مہانگری زیر ناف اور سماجی ڈسکورس، گوپی چند نارنگ

۵۔ ایک سمت کی تلاش، رحمٰن عباس، عرض مصنف، سندیپ واسلیکر، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۱، ص ۴

۶۔ ایک سمت کی تلاش، رحمٰن عباس، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۱۱ صفحہ ۱۴

۷۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔، صفحہ ۸۸

۸۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔صفحہ ۹۳

۹۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔، صفحہ ۱۸۰، ۱۸۱

۱۰۔ اکیسویں صدی کی دہلیز پر اہم اردو ناول، ابتدایہ، رحمٰن عباس۔ صفحہ ۱۱، ۱۲

۱۱۔ اکیسویں صدی کی دہلیز پر اہم اردو ناول، رحمٰن عباس، ناول بن جینا بھی کوئی جینا ہے، وارث علوی صفحہ ۱۵

۱۲۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔، صفحہ ۱۲

۱۳۔ پرانوں کی اہمیت، گوپی چند نارنگ، صفحہ ۲۷

۱۴۔ اکیسویں صدی میں اردو ناول، ڈاکٹر نعیم انیس، دی مسلم انسٹی ٹیوٹ، کولکاتہ، ۲۰۱۶، صفحہ ۳۹۲

۱۵۔ اکیسویں صدی میں اہم اردو ناول، رحمٰن عباس، ص، ۱۵۲، ۱۵۳

۱۶۔ اکیسویں صدی میں اہم اردو ناول، رحمٰن عباس، صفحہ، ۱۵۶

باب پنجم

رحمٰن عباس کے ناولوں میں فکری اور موضوعاتی تنوع

۱۹۸۰ء کے بعد لکھنے والوں کی جونئی پود ابھر کر سامنے آئی ان میں رحمٰن عباس کا نام بھی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ ایک ایسے فنکار ہیں جن کے ناولوں میں فکری اور تکنیکی اعتبار سے جدت نظر آتی ہے۔ وہ نہ صرف ناول نگار ہیں بلکہ ناول کی تنقید کے حوالے سے بھی معلوماتی مضامین لکھتے رہتے ہیں اس ضمن میں ان کی کتاب ''اکیسویں صدی میں اردو ناول'' اہم ہے۔ دراصل ۱۹۸۰ کے بعد سیاسی ،سماجی اور تہذیبی سطح پر جو بھی تبدیلیاں ہوئیں ۔فنکاروں نے ان تمام تبدیلیوں کو اپنی تخلیقات کا حصہ بنایا۔ رحمٰن عباس نے بھی بدلتے ہوئے رویوں کے ساتھ اردو ناول میں نئے تجربات کیے ان تجربات میں موضوع ،اسلوب اور ہیئت شامل ہیں ۔ یہاں اس بات کا ذکر لازمی ہے کہ رحمٰن عباس نے ناول کو کسی مخصوص ہیئت میں محدود نہیں کیا ہے اور نہ ہی انہوں نے اس طرح کی کوشش کی ہے۔ دراصل ناول کا کینوس وسیع ہوتا ہے اور وقت کے ساتھ ساتھ کئی نئی تبدیلیاں معاشرتی سطح پر نظر آتی ہیں یہی وجہ ہے کہ ناول کے مواد میں بھی تبدیلی نظر آتی ہے جس کے سبب ہیئت میں بھی تبدیلی آتی ہے۔ ہئیت کے لغوی معنی فارم یا شکل کے ہیں جس کو فنکار اپنے خیالات کی تشکیل کیلئے بروئے کار لاتا ہے ۔یہ ایک کثیر المعنی ادبی اصطلاح ہے اس ضمن میں احتشام حسین یوں رقمطراز ہے۔

''ہیئت اپنے وسیع مفہوم میں ایک طرف تو وہ طریقہ اظہار ہے جو فنکار استعمال کرتا ہے اور دوسری جانب جذبات سے بھرا ہوا وہ

پرُاثرار اور کسی حد تک مانوس انداز بیان ہے جو شاعر اور سامع کے
درمیان رابطہ اور رشتے کا کام دیتا ہے اس میں زبان کی آرائش
اثر اندازی کے تمام طریقے مواد کے تمام سانچے حسن اور لطافت پیدا
کرنے کے تمام ذرایعے اور ان سب سے بڑھ کر مواد کے ساتھ ہم
آہنگی کا احساس دلاکر ایک مکمل فنی نمونہ پیش کرنا سبھی کچھ شامل
ہے'' [1]

اردو ناول میں جہاں وقت کے ساتھ ہیئت اور تکنیک میں تبدیلی ہوتی رہتی ہے وہیں موضوعاتی سطح پر بھی اس تبدیلی کو صاف طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس تبدیلی میں سیاسی ،سماجی ،معاشرتی عوامل کا رول رہتا ہے یہی وجہ ہے کہ جب اردو ناول کا آغاز نذیر احمد کے ناول سے ۱۸۶۹ء میں ہوتا ہے تو اس وقت معاشرتی سطح پر مسلم گھرانوں میں لڑکیوں کی تعلیم اور ان کی اصلاح ایک سنگین مسئلہ تھا یہی وجہ ہے کہ نذیر احمد نے اپنے پہلے ہی ناول مراۃ العروس سے اصلاحی پہلو پر زور دیا۔اس ناول پر بات کرتے ہوئے ڈاکٹر اشفاق محمد خان یوں رقمطراز ہیں:

''یہ کہانی دہلی کے ایک متوسط شریف خاندان کی کہانی ہے
جس میں اس خاندان کے طرز معاشرت کی ہو بہو عکاسی کر کے یہ
دکھایا ہے کہ کس طرح خواتین اپنی توہم پرستی جہالت اور کج روی کے
بنا پر ہمیشہ رنج والم کا شکار رہتی ہیں۔اس ناول میں دو بہنیں اصغری

،اکبری ممتاز کردار ہیں ۔ یہ دونوں عادات و اطوار میں ایک دوسرے
کی ضد ہیں ۔نذیر احمد نے ان دونوں کی تصویریں اس طرح کھینچی
ہیں کہ فکر و عمل کے دو زاویوں کا تقابلی مطالعہ پیش نظر ہو جاتا ہے''۔[۲]

نذیر احمد کے بعد جیسے جیسے زمانے نے کروٹ بدلی اردو ناول کے موضوعات میں بھی تنوع پیدا ہوتا گیا یہی وجہ ہے کہ رتن ناتھ سرشار، عبدالحلیم شرر، مرزا ہادی رسوا ، پریم چند، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس ،عصمت چغتائی ،قرۃ العین حیدر ،انتظار حسین کے ساتھ ساتھ یہ صنف مشرف عالم ذوقی ، ذکیہ مشہدی ،حسین الحق اور شموئل احمد اور رحمٰن عباس تک پہنچتی ہے۔اس میں موضوعاتی سطح پر تبدیلی نظر آتی ہے ۔شاید ہی ئی ایسا کوئی موضوع ہو جس پر ناول نہ لکھا گیا ہے اور یہی ناول کی خوبصورتی ہے کہ اس میں متنوع موضوعات پر کھل کر اظہار خیال کرنے کی گنجائش ہے، ساتھ ہی نئی تکنیک بھی دیکھنے کو ملتی ہے۔جن میں فلیش بیک ،سوانحی طرز اور تاریخی یا شعور کی رو کی تکنیک شامل ہیں۔ناول نے ان سب کو قبول کیا ،ساتھ ہی اردو ناول نے مغرب سے آنے والے ادبی نظریوں کو بھی قبول کیا ان ادبی نظریوں میں علامت نگاری بھی شامل ہے ۔فکشن بالخصوص ناول اور افسانے کے میدان میں اس تکنیک نے ان واقعات کا ذکر کرنا شروع کیا جن کا اظہار کرنا مشکل تھا۔علامتی ناول نگاروں میں انتظار حسین ، بانو قدسیہ، غضنفر وغیرہ کے نام اہمیت کے حامل ہیں ۔ابتدا میں جتنے بھی علامتی ناول وجود میں آئے ان میں زیادہ تر پاکستان میں تخلیق کیے گئے جن کی سب

سے بڑی وجہ پاکستان کی سیاسی وسماجی صورتحال تھی۔اس ضمن میں خالد اشرف اپنے ایک مضمون میں یوں رقم طراز ہیں:

''۱۹۸۰ تک آتے آتے پاکستان میں انسانی بحران کی شدت میں شدید اضافہ ہوگیا دوسری طرف بنگلہ دیش کی تحریک و علحیدگی اور بین الاقوامی منظرنامے میں پاکستان کی شکست خوردگی نے اردو میں ایک نئی قسم کے ناول کو تحریر وتخلیق کی بنیاد قائم کی۔انتظار حسین کا ''بستی'' ۱۹۸۰ء،انیس ناگی کا ''دیوار کے پیچھے'' ۱۹۸۰ء اور انور سجاد کا ''خوشیوں کا باغ'' ۱۹۸۱ء تین ایسے ناول تھے جن میں ۱۹۷۱ء کی پیدا کردہ گھٹن اور تنگ نظری کو غیر روایتی اور علامتی انداز میں پیش کیا گیا اور ان ناولوں کے فکری اور فنی تجربوں سے جو نتیجہ برآمد ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ اپنی تشکیل کے بعد سے پاکستانی ریاست، سیاست،معیشت اور معاشرت بہ تدریج زوال اور بحران کی گہرائیوں میں ڈوبتی جارہی ہے۔ان ناولوں سے ملک کی جو تصویر ابھرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہاں فرد کے لیے ذہنی، نفسیاتی و جذباتی طور پر آزادانہ زندگی بسر کرنے اور فطری طور پر نشو ونما حاصل کرنے کے مواقع محدود ہیں اور مذہب کلچر کے نام پر ایک ایسا پرتشدد معاشرہ وجود میں آ چکا ہے جہاں تمام ڈگر سے ہٹ کر سوچ رکھنے والے شہریوں اور

اقلیتی گروپوں کے ساتھ نا رواداری کا سلوک کیا جاتا ہے ۔پچھلی صدی کی آخری دہائی تک آتے آتے پاکستان ایک ایسی سوسائٹی بن چکا ہے جہاں لبرل الزام اور جدید طرز فکر کی روشنی کم ہی پہنچ پائی ہے'' ۔۳۲

رحمٰن عباس کے ناولوں میں بھی ایک طرف موضوعاتی تنوع دیکھنے کو ملتا ہے تو دوسری طرف تکنیکی اور ہیتی سطح پر بھی جدت نظر آتی ہے۔انہوں نے علامتی اور فلیش بیک تکنیک کا خوبصورتی سے استعمال کیا ہے۔ان کے ناولوں میں زبان اور اسلوب کے عمدہ نمونے نظر آتے ہیں دراصل رحمٰن عباس کے یہاں میلان کنڈیرہ کی پیروی نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں میں کردار کا نفسیاتی جائزہ پیش کیا گیا ہے ۔یہاں کرداروں کے اندر کی کشمکش کے ساتھ ساتھ زندگی کی سچائی کی بھی تلاش نظر آتی ہے لیکن اس سچائی میں معاشرے کا وہ سچ سامنے آتا ہے جو بے حد تلخ دکھائی دیتا ہے،یہی وجہ ہے کہ ان کے ناولوں پر اعتراضات ہوتے رہتے ہیں لیکن رحمٰن عباس اپنے ناولوں میں زندگی اور معاشرے کا سچ بدستور دیکھتے رہے ان کے اب تک پانچ ناول منظر عام پر آچکے ہیں۔

(ا)موضوعاتی تنوع۔رحمٰن عباس نے سماجی ،سیاسی، تاریخی مذہبی اور جنسی موضوعات کو بیان کیا ہے۔دراصل رحمٰن عباس نے ایک ایسے دور میں شعور کی آنکھ کھولی جہاں مذہبی انتہا پسندی ،مذہبی کٹر پن،جنسی گھٹن عروج پر تھی یہی وجہ ہے کہ

انہوں نے اس انتہا پسندی کو طنز کا نشانہ بنایا۔ ناول کا مرکزی کردار جمال ہے جس کے ذریعے مصنف نے ایک طرف نئ نسل کی ذہنی ونفسیاتی کشمکش کو بیان کیا ہے وہیں دوسری طرف ہندوستان کی سیاسی صورتحال کو بھی بیان کیا گیا ہے ۔ یہ ایک ایسا ناول ہے جو بمبئ کے ماحول میں تخلیق کیا گیا ہے جس میں زندگی کی نا محرومیاں ، مایوسی اور ذہنی گھٹن جمال کے یہاں فرار کو جنم دیتی ہے وہ اپنے وجود کے تیئں تذبذب میں نظر آتا ہے اس کا ہونا یا نہ ہونا اس کے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا لیکن مصنف کے نزدیک جمال کے وجود کو تذبذب میں دکھانا برصغیر کی نئ سیاسی و معاشرتی تبدیلی کا سبب بھی ہے یہی وجہ ہے کہ نئ نسل کا جمال اپنی جڑوں سے گہری وابستگی کے باوجود بھی خود کو تنہا محسوس کرتا ہے۔ یہ تنہائی ایک ایسی گھٹن کو جنم دیتی ہے جس کے ردعمل میں جمال جیسے لاکھوں کردار یا تو فرار کا راستہ اختیار کرتے ہیں یہ اپنے وجود کو ختم کر دیتے ہیں ۔مصنف نے ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاسی سوچ کو آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے جمال کے کردار کے ذریعے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

> ’’ہندوستان کی موجودہ سیاسی و سماجی صورتحال اس بات کا گواہ ہے کہ مغل حکمرانوں اور دیگر مسلمان حملہ آوروں کی تباہ کاریوں کو جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے اور اس کا تاریخی جواز کی بنیاد پر ہم عصر ہندو معاشرے کا احیاء ہو رہا ہے گویا ایک تاریخی انتقام

لیا جار ہا ہے''۔[۱۴]

''نخلستان کی تلاش میں'' رحمٰن عباس کا پہلا ناول ہے یہی وجہ ہے کہ یہ ناول فنی نقطہ نظر سے کمزور ہے ابتداء میں زیادہ تر جنسی اور سیاسی موضوعات نظر آتے ہیں اس ناول میں بھی انہوں نے جمال کے کردار کے ذریعے ان موضوعات کا احاطہ کیا ہے۔ناول پڑھتے وقت قاری کواس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ مصنف ہندوستان کی سماجی ،سیاسی اور مذہبی کٹر پن سے ابھرنے والی پیچیدگیوں سے خوف زدہ ہے یہی وجہ ہے کہ وہ فسطائیت کو اپنانے والے حکمرانوں کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں ۔ان کے نزدیک کس طرح لوگ سیکولرزم کے جال میں پھنستے جارہے ہیں ،وہیں دوسری طرف انہوں نے جمہوریت کے نام سے لوگوں کے ساتھ جو کھلواڑ ہوتا ہے اس پر بھی طنز ہے اس ضمن میں عنبر بلال یوں رقمطراز ہیں:

> ''فسطائیت کی روش پر چلنے والے حکمرانوں کے زیر اثر عوام کی معاشی و معاشرتی اور سیاسی زندگی کو بیان کرتے ہیں کہ لوگوں کو کس طرح سیکولرزم کے پھندے میں پھانستے ہیں جہاں پر جانوروں کی ہلاکت کا تو تحفظ ہے مگر جانوروں کو ہلاک کرنے والوں کا قتل عام کیا جاتا ہے۔ دوسری طرف جمہوریت جو افیون ہے اس نظام کے سرکردہ اپنے مفادات کے حصول کے لیے عوام کو بنیادی حقوق کی دستیابی کے لالچ میں پھانس کر اپنا محافظ بنا لیتے ہیں اور پھر سماجی و

معاشی طبقات کو تشکیل کر کے خود پسندی و تعصب او جدالی کے میدان

میں چھوڑ دیتے ہیں''۔۵؎

دراصل ہندوتوا کے نام پہ نفرت جو پھیلائی جا رہی ہے مصنف ایسی منفی سوچ سے سخت فالاں نظر آتا ہے۔ یہ کسی بھی ملک کی خوشحالی اور اس کی ترقی کیلئے خطرناک ہوتی ہے۔ انہوں نے سیاسی، سماجی، تاریخی اور تہذیبی اقدار کے پس پشت اس سوچ کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے جو انسانیت کی دشمن ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے انسانی زندگی کو جانور کی زندگی کے مقابلے غیر محفوظ قرار دیا ہے۔ یہاں وہ کرب بھی ابھر کر سامنے آتا ہے جو اقلیتی طبقے نے سہا لیکن اس کے باوجود وہ اپنی جڑوں سے گہری وابستگی ظاہر کر رہا ہے۔ ناول میں کشمیر کے حالات کا بھی ذکر ہے جہاں زندگی ایسے تذبذب کا شکار ہے۔ رحمٰن عباس نے اس ناول میں ہندوستان کی بدلتی ہوئی سیاست اور مذہبی کٹر پن کو طنز کا نشانہ بنایا ہے ساتھ ہی جمہوریت کو جس طریقے سے سیاسی جماعتوں نے اپنے مفاد کی غرض سے استعمال کیا ہے اس سے جمہوریت کٹھ پتلی بن گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آئے دن اقلیتی طبقے کے لوگ خود کو غیر محفوظ تصور کرنے لگے ہیں لیکن مصنف کے نزدیک دھیرے دھیرے یہ طبقہ اس حد تک بے بس ہوتا جا رہا ہے کہ ہر چیز کو قبول کرنے پر مجبور ہو رہا ہے یہی بے بسی جمال میں بھی نظر آتی ہے۔ مصنف جمہوریت پر کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے وہ جانتا ہے کہ جمہوریت کے نام پر لوگوں کو اپنے بنیادی حقوق سے محروم کر کے انہیں غلام

بنایا جارہا ہے ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

''جمہوریت ایک کارگر اگر کلوروفام ہے جس کے استعمال سے ہندوستانی عوام کو انسان اقدار اور اصول حیات سے بے خبر کر دیا گیا ہے۔ افراد کی مجموعی یاداشت کو فراموشی کے اتھاہ سمندر میں ڈوبا دیا گیا ہے''۔٦ے

یہ ناول موضوع کے اعتبار سے اہم ہے لیکن فنی اعتبار سے بے حد کمزور ناول ہے جس میں مصنف افسانہ نگار کم واعظ زیادہ لگتا ہے۔ تکنیک اور اسلوب کے اعتبار سے بھی کہانی میں کوئی جدت نہیں ہیں ساتھ ہی کہانی میں کہانی پن کم ہی نظر آتا ہے ۔کردار بھی کٹھ پتلی معلوم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ اس ناول کو ادبی حلقوں میں کوئی شہرت نہیں ملی۔

''ایک ممنوعہ محبت کی کہانی'' یہ ان کا دوسرا اہم ناول ہے۔ یہ ناول کوکن کے تاریخی وسماجی پس منظر میں لکھا گیا ہے۔ اس ناول کا مرکزی کردار عبدالعزیز ہے۔ اس کے علاوہ ناول کے دیگر کرداروں میں میں سکینہ، مجاور حسین اور یوسف شامل ہیں۔ عبدالعزیز کا کردار ناول میں ہر قدم پر اپنی موجودگی کا احساس کراتا ہے ۔ناو ل عصری زندگی کے مسائل کی بھی ترجمانی کرتا ہے ۔ یہ ناول سیاسی کشمکش اور مذہبی انتہا پسندی کے ساتھ ساتھ قومی یکجہتی پر بھی طنز ہے ۔ یہاں تعلیم کے سبب بڑھنے والی شدت پسندی کو بھی دیکھا جاسکتا ہے اس میں عبدالعزیز اور یوسف کے ساتھ ساتھ

دوسرے کردار بھی نظر آتے ہیں ۔ یہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں محبت اور مذہب کا بول بالا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ نہ تو یہ معاشرہ محبت کو قبول کرتا ہے اور نہ ہی مذہب کی انتہا پسندی کو یہی وجہ ہے کہ عبدالعزیز جس جنسی تجربے کے سبب سکینہ کو اپنا سب کچھ سمجھ بیٹھتا ہے اس کا انجام بے حد خطرناک ہوتا ہے اور اپنے ہی بیٹے یوسف کے ہاتھوں قتل ہوتا ہے۔ مصنف کا کمال یہ ہے کہ یہ انسانی نفسیات پر گہری دسترس رکھتے ہیں ۔احساسات و جذبات کی بھرپور ترجمانی کرتے ہیں ۔ یہ ناول کوکن کی تہذیبی زندگی کا سرچشمہ بھی ہے لیکن وہیں دوسری طرف اب اس جگہ پر مذہبی جماعتوں کے سبب کافی انتشار پیدا ہو گیا ہے یہی وجہ ہے کہ ہندو مسلمانوں کے درمیان تضاد بڑھنے لگا ہے اور اس تقاد کو پیدا کرنے والے مذہبی لوگ ہیں ۔اس ضمن میں عنبر بلال یوں رقمطراز ہیں:

> ''رحمٰن عباس نے اپنے اس ناول میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ ایک گاؤں میں مختلف مذہبی جماعتیں اپنا مشن جاری کرتی ہیں جس کے سبب شہریوں کے بدن پر ٹخنے سے اونچا پاجامہ، لمبا کرُتا اور سروں جعلی اور ٹوپیاں اور چہروں پر داڑھی آجاتی ہے ۔سورل جہاں ہندو و مسلم آبادی کوکنی زبان بولتی تھی یا پھر مرہٹی زبان میں تعلیم حاصل کرتی تھی، وہاں اب جماعت مرہٹی زبان کو ہندوؤں کی زبان قرار دیتی ہیں اور اردو کا چلن شروع ہوتا ہے ۔اس کے ساتھ سورل

کی وہ گنگا جمنی تہذیب جس میں گنیش اُتسو، دیوالی، دسہرہ، ہولی، عرس
،عیدیں جو مشترکہ طور پر منائے جاتے تھے ان میں کافر اور مومن کا
فرق پیدا ہو جاتا ہے ہے ۔خود مسلمان بھی مختلف فرقوں میں بٹ
جاتے ہیں ہر مسلک اپنے مسلک کو درست اور دوسرے کو باطل قرار
دیتا ہے۔ ے

یہ ایک ایسا ناول ہے جس میں مذہبی جماعتوں کو گاؤں کے ماحول کو بگاڑتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔مصنف کے نزدیک کچھ عرصہ پہلے گاؤں میں جو محبت اور بھائی چارے کی فضا موجود تھی وہ اچانک اس شدت پسندی کا شکار ہوگئی اس شدت پسندی کا جیتا جاگتا نمونہ یوسف کی شکل میں سامنے آتا ہے جو اپنے باپ کو شدت پسندی کے سبب قتل کر دیتا ہے ۔ناول میں اس فرقہ وارانہ سوچ کے سبب مصنف دوٹوک الفاظوں میں اس نظام پر طنز کرتا ہے۔ان کے نزدیک جو جماعت یا مذہب زبانوں کا بٹوارہ کرائے وہ فساد کی جڑ ہے ۔دراصل تہذیب کلچر اور زبان سے معاشرہ ارتقا کی منزلیں طے کرتا ہے لیکن المیہ یہ ہے کہ ان چیزوں کو ہتھیار بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور لوگوں پر زبردستی تھوپی جاتی ہیں:

”زبان کلچر اور مذہب یہ سیاسی لوگوں کی ہتھیار ہیں ساری
دنیا ان کے نام پر خون خرابے سے گزری ہے ہر بڑی زبان بڑا کلچر
بڑا مذہب اپنی بالادستی کے لیے دنیا کو جہنم بنا دیتا ہے“ ۔ ۸

ناول میں طبقاتی کشمکش اور فرقوں کے درمیان بھی انتشار نظر آتا ہے۔ دراصل اس انتشار کو پیدا کرنے والے مذہبی رہنما ہیں جو اپنی اپنی جماعت کے محافظ بن کر دوسری جماعت پر طعنہ کستے ہیں یہی وجہ ہے کی جب عبدالعزیز نے مراٹھی زبان میں ایک مضمون لکھ کر درگاہ کی بدحالی کا ذکر کیا تو لوگوں نے اس کا احتجاج کرنا شروع کیا ساتھ ہی یہ مضمون عبدالعزیز سے دشمنی رکھنے والے یوسف کو دکھایا گیا۔ ناول کا اقتباس ملاحظہ ہو:

> ''عبدالعزیز نے ثقافت کی موت کے عنوان سے مراٹھی روزنامے کے لیے ایک مضمون لکھا جس میں اس نے درگاہ کی بدحالی اور اور عرس کے خاتمے سے پیدا ہونے والی صورتحال کو تفصیل سے بیان کیا اس مضمون کو وہابی افراد نے ایک سازش قرار دیا۔ایک صاحب نے بعد میں اس کا ترجمہ اردو میں کر کے یوسف کو پیش کیا جس نے درگاہوں کی بدعت کی ماں قرار دیا تھا''۔[9]

یہ ناول اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے ناول میں جتنے بھی واقعات شامل ہوئے وہ معنی خیز ہیں ۔مصنف نے محض اسے کوکن کی تہذیب و ثقافت تک محدود نہیں رکھا بلکہ اس میں زندگی کے کے متنوع پہلوؤں کو بیان کیا گیا ہے یہاں ایک طرف محبت، ثقافت، کلچر کا ذکر کیا گیا ہے وہیں دوسری طرف سیاسی ،سماجی ،جنسی اور مذہبی انتہا پسندی کو بھی اظہار کا جامع پہنایا گیا ہے۔ یہ ناول مصنف کے پہلے ناول

کے مقابلے میں زیادہ جاندار ہے فنی نقطہ نظر سے بھی یہ ناول عمدہ ہے ساتھ ہی اس ناول میں مصنف نے ہندوتوا کے برعکس مسلمانوں کے یہاں مذہبی انتہا پسندی کو لے کر جو معاملات ابھر کر سامنے آتے ہیں ان کا بیان کیا ہے۔

''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی'' میں بھی مختلف موضوعات نظر آتے ہیں لیکن یہاں مرکزی کردار عبدالسلام کے ذریعے خدا اور اس کے وجود کے بارے میں کھل کر بحث دیکھنے کو ملتی ہے۔ یہ ایک فلسفیانہ ناول ہے ساتھ ہی اسے نفسیاتی ناول بھی قرار دیا جاسکتا ہے۔مصنف نے بڑی باریکی کے ساتھ انسانی نفسیات کی عکاسی کی ہے۔عبدالسلام کا کردار اس ضمن میں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے جو اس نظام سے تنگ نظر آتا ہے اور اس تنگی اور گھٹن کے لیے خدا کو ذمہ دار بھی ٹھہرایا جاتا ہے ۔ یہ ناول مذہبی ٹھیکیداروں پر طنز ہے جو اپنی مرضی کے مطابق اسلام کو استعمال کرتے ہیں جس کا مصنف کو ملال ہے۔ناول کا مرکزی کردار خدا کے متعلق مختلف نظریات کو پیش کرتا ہے، یہاں زندگی کا گہرا فلسفہ بھی اُبھر کر سامنے آتا ہے۔

یہ ناول اگر پاکستان کے سیاسی منظر نامے میں دیکھا جائے تو پاکستان کی سیاسی تاریخ ہمارے سامنے آتی ہے خاص کر مارشل لا کے دور میں جب مذہبی رہنماؤں کو کھلی آزادی ملی تھی اور انہوں نے ایسے قوانین نافذ کیے جن کو عوام نے جبراً تسلیم کیا۔ یہ ناول خدا کی بنائی ہوئی کائنات میں انسان کی انتہا پسندی اور شدت پسندی کو پیش کرتا ہے جو اسلام یا کسی دوسرے مذہب کو اپنی دلچسپی کے مطابق

استعمال کرتا ہے۔اتنا ہی نہیں خدا کو بھی اپنی ضروریات کے مطابق گھڑا جاتا ہے۔ یہ ناول بہت سارے سوالوں کو جنم دیتا ہے جن کے سبب عام قاری تشکیک کا شکار ہونے لگتا ہے۔ دراصل معاشرتی سطح پر جو انتشار پیدا ہو چکا ہے ذی شعور انسان اس سے تنگ آ چکا ہے اس تفریق اور فرقہ واریت سے اس کے اندر عجیب سی گھٹن پیدا ہو گئی ہے یہی وجہ ہے کہ عصر حاضر کا انسان زندگی سے مایوس نظر آتا ہے۔ یہ ناول فلسفیانہ نقطوں کو قاری کے سامنے لاتا ہے اور مذہب کے لئے قاری کے دل میں مختلف خیالات جنم لیتے ہیں اس بات کا ذکر کرنا ضروری ہے کہ یہ خیالات مذہبی ٹھیکیداروں کے سبب بھی ہیں جن پر سوال اٹھانا کفر قرار دیا جاتا ہے۔

''روحزن'' رحمٰن عباس کا مشہور ناول ہے اس ناول پر مصنف کو ساہتیہ اکاڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ناول میں اسرار اور حنا کے ذریعے ممبئ کے دلکش اور پرفریب زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ناول کا پلاٹ بے حد گھٹا ہوا ہے۔ یہ ناول فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ ناول کا آغاز ہی کہانی کے انجام سے ہوتا ہے ۔ یہاں اسرار ایک ایسا کردار ابھر کر سامنے آتا ہے جو گاؤں چھوڑ کر کر بمبئ کی چکا چوند زندگی کا حصہ بن جاتا ہے لیکن بمبئ کی زندگی اتنی آسان نہیں یہاں آ کر کہانی کا مرکزی کردار تذبذب کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہاں طوائفوں سے لے کر زندگی کے ہر معاملات میں ایک بے بسی اور بے چینی نظر آتی ہے۔ اسرار اور حنا کے علاوہ ناول میں یوسف تاجر ایمل شانتی اور مس جمیلہ کے کرداروں کے ذریعے بھی انسان کی

ذہنی اور جنسی گھٹن کو پیش کیا گیا ہے۔ناول میں جہاں دیگر موضوعات کو کو قلم بند کیا گیا ہے وہیں مذہبی انتہا پسندی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے ۔ یہاں مولوی کا بکری کے ساتھ مباشرت کرنا خدا کے وجود کو مشکوک قرار دینا اور شیطان کے ساتھ جو کچھ ہوا اسے نا انصافی قرار دینا جیسے موضوعات بھی نظر آتے ہیں ایمل اور یوسف کے کرداروں کے ذریعے آزاد خیالی کو فروغ دینا ساتھ ہی ایمل کا کھل کر اپنی آزاد خیالی کو سماج میں فروغ دینے کی طرف بھی اشارہ ملتا ہے۔

اس ناول کا مرکز ومحور بمبئی ہے وہ بمبئی جس کے بطن میں وہ سب کچھ موجود ہے جو انسانی وجود کو سوالات کی چوکھٹ پر کھڑا کر کے تذبذب میں ڈالنے کے لیے کافی ہے اور جن کے جوابات کے لیے ناول کا مرکزی کردار اسرار قدم در قدم متلاشی نظر آتا ہے اور ہر سوال کا جواب اسے جنس کی دہلیز پر پہنچا دیتا ہے جہاں اسے جنسی تسکین تو ملتی ہے لیکن ذہنی اور روحانی تسکین ہر گز نہیں ۔رحمٰن عباس کا کا یہ ناول موضوعاتی اعتبار سے اپنے اندر گہری وسعت رکھتا ہے۔اس میں محض جنس کو موضوع نہیں بنایا گیا ہے بلکہ اس میں مذہب ،سیاست اور سماج کے گونا گوں پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے ۔رحمٰن عباس کا ناول ''زندیق'' میں بھی مذہبی کٹر پن کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے ۔ یہ ناول اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا ناول ہے جس میں محبت ، رومان ،خواب ،جنس ،عقیدہ گویا ہر طرح کے واقعات کو پلاٹ میں شامل کر دیا گیا ہے ۔اس ناول کا بیانیہ بے حد دلچسپ ہے ناول کا آغاز اس یدھ سے شروع ہو کر موجودہ جرمنی پر ختم

ہوتا ہے۔اس ناول میں تمام سرحدوں کو پھلانگ کر دنیا کے معاملات کو بڑے غور وفکر کے بعد پیش کیا گیا ہے ساتھ ہی ناول میں مذہبی شدت پسندی کے سبب برصغیر میں جو ماحول پیدا ہوا ہے اس کا اظہار بھی ناول نگار نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ کیا ہے ۔مذہبی انتہا پسندی کے علاوہ اس ناول میں سیاسی اور سماجی انتشار کو بھی پیش کیا گیا ہے ۔یہ ناول موضوع کے اعتبار سے اپنے اندر جدت رکھتا ہے یہی وجہ ہے کہ یعقوب یاور اس ناول کے موضوع پر بات کرتے ہوئے اسے ''اردو میں ایک نئی دستک کا نام دیتے ہیں۔''رحمٰن عباس کے ناولوں میں موضوعاتی اعتبار سے اتنی وسعت نظر نہیں آتی ہے دراصل ان کے ناول جنس اور مذہب کے گرد ہی طواف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں ہاں اتنا ضرور ہے کہ ان موضوعات میں انہوں نے جزیات سے کام لیا ہے یہ ناول بدلتی ہوئے قدروں کے درمیان فرد کی ذہنی کشمکش کو پیش کرتا ہے۔ یہاں ایک طرف نئی قدروں سے رغبت اور پرانی قدروں سے انحراف نظر آتا ہے لیکن ساتھ ہی ان نئی قدروں سے جو پامالی ابھر کر نظر آتی ہے اس کا بھی المیائی اظہار نظر آتا ہے۔مصنف نے اپنے ناولوں میں مذہبی انتہا پسندی اور جنسی ناآسودگی کے پس منظر میں فرد کی ذہنی کشمکش کو ظاہر کرنے کی سعی کی گئی ہے یہاں فرد کی تنہائی ،اجنبیت اور جنسی گھٹن کے باوجود نئی قدروں کو گلے سے لگانے کی خواہش دیکھنے کو ملتی ہے لیکن یہ خواہش اسرار، جمال ،ثناءاللہ جیسے کرداروں کو جنم دیتی ہے جو تمام عمر ذہنی وقلبی سکون کے لیے کشمکش میں نظر آتے ہیں۔رحمٰن عباس کا کمال

یہ ہے کہ انہوں نے محدود موضوعات میں بھی اتنی وسعت پیدا کی ہے کہ قاری ناول کا مطالعہ کرتے وقت یکسانیت محسوس نہیں کرتا ہے بلکہ مذہب اور جنس کی اتنی صورتیں بیان کی گئی ہیں کہ یہ ناول اردو کے کامیاب ناولوں میں شمار کیے جاتے ہیں بالخصوص روحزن اور زندیق۔

رحمٰن عباس نے زندگی کی گہرے تجربات اور مشاہدات سے جو کہانیاں تخلیق کی ہیں ان میں تخلیقیت کے ساتھ ساتھ وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو اچھے ناول میں ہونا ضروری ہیں دراصل یہ کہانیاں فنی نقطہ نظر سے اہم ہیں یہاں زبان کے ساتھ ساتھ اسلوب، تکنیک اور ہیتی سطح پر بھی ندرت نظر آتی ہے۔''نخلستان کی تلاش'' سے لے کر'' زندیق'' تک انہوں نے جو کچھ لکھا وہ ناول کے جدید منظر نامے کا اہم حصہ ہے ۔عصر حاضر میں جس طریقے سے کہانی زندگی کی نئ حقیقتوں کا اظہار کر رہی ہے مصنف کے ناول بھی انہی حقیقتوں سے پردہ کشی کا کام کرتے ہیں یہاں مذہب، کلچر ،تہذیب، جنس اور محبت کی تصادم سے پنپنے والے رشتوں کی ناپائیداری صاف نظر آتی ہے ان ناولوں میں عصر حاضر کا وہ سچ دیکھنے کو ملتا ہے جس سے ہر فرد دو چار نظر آتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ معاشرہ جس طریقے سے مذہب کی انتہا پسندی اور قومیت کے منفی تصور میں داخل ہو چکا ہے اس کے منفی اثرات دھیرے دھیرے برصغیر کے لگ بھگ سبھی ممالک پر پڑنے لگے ہیں، ہندوستان پاکستان جیسے ممالک بھی کچھ دہائیوں سے اس کے اثرات سے محفوظ نہیں رہ پائے ہیں یہی وجہ ہے کہ

زندیق کا ثناء اللہ جرمنی کے نازی ازم کے اثرات سے واقف کرانے کی کوشش کرتا ہے دراصل زندیق کا مطالعہ نئی نسل کے لیے اس لیے بھی ضروری ہے تا کہ نئی نسل اس چکرویو کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائے جس کے خطرناک اثرات پورے برصغیر کو اپنے لپیٹے میں لینے کے لیے تیار ہے۔ رحمٰن عباس نئی نسل کو مذہب کی انتہا پسندی کے پس پشت چھپی اس منفی تصویر کو دکھانے کی کوشش کرتا ہے جس کے منفی نتائج کسی بھی وقت سامنے آسکتے ہیں۔ فسطائیت کسی بھی قسم کی ہو وہ کسی بھی ملک کی مشترکہ تہذیبی زندگی کے لیے خطرہ ہوتی ہے اور یہ خطرہ چند برسوں میں برصغیر کے مختلف ممالک سے صاف ابھرتا ہوا نظر آتا ہے۔ رحمٰن عباس کے ناول ان تمام حد بندیوں سے بالاتر نظر آتے ہیں جہاں موضوع کو شجر ممنوعہ قرار دے کر مصنف پر لعن طعن کی جاتی ہے یہاں بلاشبہ مذہب اور جنس کے بغیر کچھ نظر نہیں آتا ہے لیکن یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ عصر حاضر میں تمام دنیا مذہبی انتہا پسندی اور جنسی ناآسودگی کا شکار نظر آتی ہے یہی وجہ ہے کہ رحمٰن عباس نے عصر حاضر کے ان دو سنگین مسائل کا احاطہ اپنے ناولوں میں کیا ہے۔ مصنف نے بڑی باریکی سے مذہبی سیاست کو کہانی کی صورت میں بیان کیا ہے دراصل یہ مذہبی سیاست اور جنسی ناآسودگی فرد کی تنہائی کا سب سے بڑا سبب ہے یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ جمہوری نظام میں بھی قومیت کا جو منفی تصور اُبھر کر آرہا ہے اس نے اقلیتی طبقے کو تذبذب میں ڈالا ہے۔ مصنف نے اپنے ناولوں میں اقلیتی طبقے کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور حق

تلفی کا بھی اظہار کیا ہے۔نخلستان کی تلاش اس کی عمدہ مثال ہے جہاں ہندو فسطائیت نے جمہوری نظام کے باوجود اپنی قومیت کے نظریے کو حد درجہ بڑھاوا دینے کی کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ اقلیتی طبقہ اپنی شناخت کو لے کر تذبذب میں نظر آرہا ہے۔ رحمٰن عباس فرد کی اسی تذبذب کو اپنے ناولوں کے ذریعے بیان کرتا ہے انہوں نے موضوعاتی اعتبار سے بے شک اردو ناول کے میدان میں منفرد مقام نہیں پایا ہولیکن انہوں نے جس طریقے سے مذہب کے بے شمار پہلوؤں کو بیان کیا ہے اس سے یہ صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کہانی لکھنے کے فن سے واقف ہے یہاں محض مذہب اوراس کی انتہا پسندی نہیں ہے بلکہ مذہب کے جتنے ممکنہ پہلو ہو سکتے ہیں خواہ وہ مثبت ہوں یا منفی ان سب کا اظہار کہانیوں کی صورت میں کیا ہے۔ یہاں مذہب کی آڑ میں ہندوفسطائیت، جمہوریت کا کھوکھلا پن ،اقلیتی طبقے پر تشدد ،مشترکہ تہذیبی روایت کا زوال، قدروں کی پامالی اور کلچر کی بازیافت کا خوبصورت اظہارنظر آتا ہے۔مصنف قدروں کے زوال اور مشترکہ تہذیبی عناصر کی بکھرتی ٹوٹتی تاریخ کا المیائی روپ بیان کرتا ہے یہاں یوسف اور عبدالعزیز جیسے کردار دومختلف تہذیبی زندگی کے نمونے ہیں لیکن یہ دومختلف تہذیب چند برسوں میں جس طرح سے استحصال کا شکار ہوگئی ہیں اس کا ذمہ دار یوسف جیسے کردار ہیں جو اس تہذیب کی ان روایات کا دشمن ہے جو صدیوں سے ایک دوسرے میں پیوست نظر آتی ہیں۔ رحمٰن عباس اس لیے بھی بڑا فنکار ہے کہ انہوں نے ایک اچھے ادیب کی طرح بدلتی

ہوئی قدروں کا جائزہ لیا ہے اور ان قدروں کی پامالی کے لیے کسی ایک طبقے کو قصوروار نہیں ٹھہرایا ہے بلکہ اس پامالی اور استحصال کا ذمہ دار اسی کو ٹھہرایا ہے جو حقیقی معنوں میں مشترکہ تہذیبی روایت کا دشمن ہے خواہ وہ یوسف کی صورت میں ہی سامنے کیوں نہیں آتا ہے سورل کی تہذیبی زندگی جس میں مشترکہ تہذیبی عناصر چار چاند لگاتے تھے دھیرے دھیرے وقت کی رفتار نے اس پر منفی اثرات ڈالنے شروع کیے ہیں اس کے پس پشت وہ منظرنامہ ہے جو پچھلے تین دہائیوں میں برصغیر میں اُبھر کر سامنے آیا ہے۔ یہاں پر لبرل ازم اور مارکسزم سے اُبھرنے والی منفی تصویریں بھی ہیں اور جمہوری نظام کی بے بسی اور لاچاری بھی ساتھ ہی مذہبی اور قومیت کے منفی اثرات بھی جنہوں نے ادیبوں کی بہت بڑی کھیپ کو اس بات پر سوچنے پر مجبور کیا ہے کہ مذہب کی انتہا پسندی پورے برصغیر کے لیے خطرہ بنتی جارہی ہے جس کے منفی نتائج کسی بھی صورت میں سامنے آسکتے ہیں رحمٰن عباس نے ناول زندیق اور ایک ممنوعہ محبت کی کہانی میں انہی خطرات کی طرف صاف اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے اسرار اور حنا کے ذریعے بمبئی کی پراسرار زندگی کو جس طریقے سے بیان کیا ہے اسے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ممبئی دہشت گردانہ حملے کی امجگاہ بنی ہوئی ہے اور وقتاً فوقتاً اس کے پرسکون ماحول میں کسی نہ کسی طریقے سے خلل پہنچانے کی بھرپور کوشش کی جاتی ہے اس خلل کے پس پشت ان طاقتوں کا براہ راست اثر نظر آتا ہے جن کی باگ ڈور مذہبی پیشواؤں کے ہاتھوں میں نظر آتی ہے، مصنف تہذیب کلچر اور تمدن کے دشمن کو

پوری انسانیت کا دشمن تصور کرتا ہے۔ان کے ناولوں میں مذہب جس طریقے سے سرایت کر چکا ہے اسے دیکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رحمٰن عباس کا نظریہ مذہب کے دائرے میں طواف کرتا ہوا نظر آتا ہے لیکن اس دائرے میں انہوں نے اتنی وسعت اور گہرائی پیدا کی ہے کہ پورا برصغیر اس میں سمایا ہوا نظر آتا ہے چونکہ رحمٰن عباس خود بھی اس چیز کو شدت سے محسوس کر رہا ہے کہ آنے والے وقت میں برصغیر اس مذہبی انتہا پسندی کے سبب بربادی کے دہانے پہ کھڑا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کے ناول اس طرح کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں انہوں نے کردار، مکالمے اور زبان و بیان کی سطح پر فن کو مجروح ہونے نہیں دیا اور نہ ہی ان کی کہانیاں پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والا ادیب نہیں بلکہ واعظ یا خطیب ہے، یہ ان کی فنی بصیرت اور کہانی لکھنے کے فن سے گہری واقفیت کا ثمرہ ہے۔ بلاشبہ رحمٰن عباس نے محدود موضوع میں اتنا تنوع پیدا کی ہے کہ انہیں روحزن پر ساہیتہ اکاڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ان کے ناول شدت پسندی، بغاوت اور احتجاجی رویے کے حامل ہونے کے باوجود زبان کی لطافت سے محروم نظر نہیں آتے ہیں ناول زندیق طویل ہونے کے باوجود بھی زبان کی لطافت سے محروم نہیں ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ ناول کی طوالت قاری کو کھٹکتی ہے لیکن ناول کو سنجیدگی سے پڑھا جانا ضروری ہے دراصل ان کے ناولوں میں جس طریقے سے جنسی موضوعات کا اظہار ہوا ہے وہ قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب ہوتے ہیں ۔رحمان عباس کے ناولوں میں

اگرچہ موضوعاتی تنوع نظر نہیں آتا ہے اور ان کے ناول مذہب اور جنس کے گرد ہی طواف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں لیکن اس محدود دائرے میں بھی انہوں نے ان تمام ممکنہ پہلوں کو خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے ساتھ ہی ناولوں میں کردار، مکالمہ، منظر نگاری اور زبانوں بیان کی سطح پر جو فنی بصیرت نظر آتی ہے اس سے موضوع کی یکسانیت قاری پر گراں نہیں گزرتی ہے اور یہی رحمٰن عباس کے ناول کی سب سے بڑی کامیابی ہے۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ رحمٰن عباس نے اپنے ناولوں میں مختلف موضوعات کو بیان کیا۔ان کے یہاں موضوعات کی رنگا رنگی دیکھنے کوملتی ہے لیکن انہوں نے اپنے ناولوں میں میں مذہبی انتہا پسندی کوکوسخت تنقید کا نشانہ بنایا ہے۔ان کے نزدیک برصغیر میں جس طریقے سے مذہبی کٹر پن اور مذہبی شدت پسندی عروج پا رہی ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عالمی سطح پر اس کے منفی اثرات پڑنے طے ہیں اتنا ہی نہیں جس طریقے سے پچھلی تین دہائیوں میں برصغیر میں مذہب کو لے کر بحث و مباحثہ ہو رہے ہیں وہ کسی بھی اقلیتی طبقے کے لیے مضر ثابت ہو رہا ہے ۔ہندوستان جیسے ملک میں بھی مذہب کی انتہا پسندی نے بہت سے سنگین مسائل کو جنم دیا ہے۔ناول ''روحزن'' اور ''زندیق'' اس سلسلے کی اہم کڑیاں ہیں۔ان ناولوں میں مذہب اور اس سے پیدا شدہ مسائل کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ رحمٰن عباس کسی مذہب کی بنیادی آئیڈیالوجی کے خلاف نہیں نظر آتے بلکہ ان کے

نزدیک کٹر پن کا پہلو کسی بھی طریقے سے معاشرے کے لئے مثبت ثابت نہیں ہو سکتا ہے انہوں نے انسان مذہب اور خدا کے متعلق جو کچھ کرداروں کے ذریعے بیان کیا ہے اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مذہب دھیرے دھیرے غلط ہاتھوں میں کٹھ پتلی کی طرح ناچ رہا ہے یہی وجہ ہے کی شدت پسندی اور کٹر پن والی سوچ اپنا دائرہ وسیع کرتی جا رہی ہے جو نہ تو مصنف کو قبول ہے اور نہ ہی معاشرے کے باشعور طبقہ کو۔ رحمٰن عباس نے اپنے تمام ناولوں میں مذہبی کٹر پن اور اس سے ابھرنے والے مسائل کا احاطہ کر کے اسے سخت ملامت کا نشانہ بنایا ہے انہوں نے کرداروں کے ذریعے شدت پسندی کے تمام منفی اثرات سے قاری کو واقف کرانے کی سعی کی ہے۔

(ب)جنسی موضوعات:رحمٰن عباس کے ناولوں میں جہاں دیگر موضوعات دیکھنے کو ملتے ہیں وہیں ان کے ناولوں میں جنسی موضوعات کا بھی کھل کر اظہار دیکھنے کو ملتا ہے دراصل جنس کا انسانی زندگی کے ساتھ اٹوٹ رشتہ ہے جس کی حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا چونکہ ادب سماج کا آئینہ ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ فن کار جنسی جذبات کے اظہار سے منہ نہیں موڑ سکتا ہے لیکن یہاں اس بات کا ذکر لازمی ہے کہ جنسی موضوعات کا اظہار شہوت پرستی تک محدود نہیں ہونا چاہیے بلکہ جنس کا صحت منداظہار فن پارے کی آفاقیت کا ضامن ہوتا ہے۔ کلاسیکی ادب سے لے کر دور حاضر تک فنکاروں نے اس موضوع کو

ہر طریقے سے بیان کرنے کی سعی کی ہے یہی وجہ ہے کہ جنس کو آرٹ میں محلول کر دینا فن پارے کا حسن سمجھا جاتا ہے ۔اس ضمن میں ڈاکٹر محبوب علی قریشی یوں رقمطراز ہیں:

''ادب وشعر میں جنس کو پیش کرنے کا سوال اہم نہیں بلکہ آرٹ میں اس کو محلول کر دینا دراصل حسن ہے۔موضوع کوئی اور کیسا ہو اصل شہرت یا تقاضائے فن یہ ہے کہ یہ موضوع اس کی محسوسات میں بدل جائے یہ مسئلہ نہ صرف جنس جیسے موضوعات کے ساتھ ہے بلکہ کسی نظریے یا فلسفے کی پیش کش میں بھی یہی سوال درپیش ہے۔فن شاعری جس قدر زندگی سے قریب تر ہوگا اس قدر زیادہ سے زیادہ جنسی ہوگا جنس سے مراد شہوت پرستی یا بوالہوسی نہیں جنس کا سرچشمہ عشق، محبت، حسن، سراپا وصل وہجر ہے'' [۱۰]

رحمٰن عباس کے ناولوں میں فرد کی گھٹن اور ذہنی کشمکش کے لیے کسی حد تک جنسی ناآسودگی بھی ذمہ دار ہے اور اس جنسی ناآسودگی کے سبب فرد تنہائی کا شکار ہو جاتا ہے۔ رحمٰن عباس کے ناولوں میں منٹو اور عصمت کی طرح جنسی کجروی کا اظہار نظر نہیں آتا ہے اور نہ ہی ان کے یہاں جنس کا کوئی صحت مند نظریہ دیکھنے کو ملتا ہے بلکہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے جنس کا اظہار کہانی کو طوالت اور قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرانے کے لیے کیا ہے دراصل رحمٰن عباس کی یہاں جنسی

کجروی اور جنسی گھٹن نظر آتی ہے لیکن انہوں نے زیادہ تر مذہب کو ہی اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا ہے۔ ان کے ناول نخلستان کی تلاش میں مذہب کی انتہا پسندی نظر آتی ہے وہیں ایک ممنوعہ محبت کی کہانی میں جنسی موضوعات پر اظہار خیال کیا گیا ہے یہاں جنس ایک صحت مند نظریے یا کسی گہرے تجربے کی صورت میں سامنے نہیں آیا ہے بلکہ ایک کم عمر کا لڑکا اپنی سے ادھیڑ عمر کی عورت سے اتفاقاً جنسی تعلق قائم کر لیتا ہے لیکن یہ جنسی تعلق اسے زندگی کے ایک نئے لطف سے ہمکنار کرتا ہے مصنف بے شک اسے ایک نئے لطافت کا نام دیتا ہے اور اس تعلق سے عبدالعزیز کو پوری عمر سرشار دکھاتا ہے لیکن حقیقی معنوں میں یہ جنسی تجربہ ایک گہرے تصادم کو جنم دیتا ہے اور اس کی صورت ہوس میں تبدیل ہو جاتی ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ تعلق اکثر قائم ہونے لگتا ہے جس کے ردعمل میں سکینہ ایک ناجائز بچے کو جنم دیتی ہے یہاں اس بات کو ذہن میں رکھنا لازمی ہے کہ پورے ناول میں ایک طرح جنسی گھٹن اور اس کی بے راہ روی سے پیدا شدہ مسائل نظر آتے ہیں تو وہیں دوسری طرف مذہبی انتہا پسندی کے سبب سورل کی مشترکہ تہذیبی زندگی بکھرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ رحمٰن عباس جس جنسی تجربے کو بنیاد بنا کر کہانی کا پلاٹ تیار کرتا ہے وہ بے راہ روی کو جنم دیتی ہے جس کے نتیجے میں یوسف جیسا کردار وجود میں آتا ہے جو اپنی ہی ماں کو غیر مرد کے ساتھ تعلقات بناتے ہوئے دیکھتا ہے یہاں یوسف کا مذہبی ہونے کے برعکس اپنی ماں کے تئیں ایسا نظریہ وجود میں آتا ہے جس سے رشتوں کی پامالی کا سچ ظاہر

ہوتا ہے اورشعوری طور پر وہ عبدالعزیز کوقتل کرنے پر آمادہ ہوتا ہے یہاں مصنف جس طریقے سے جنسی کجروی کو بیان کیا ہے وہ غیر فطری معلوم ہوتی ہے وہیں دوسری طرف روحزن میں بھی انہوں نے اسرار،حنا، شانتی اور مس جمیلہ کے کرداروں میں جنسی تعلق کو غیر ضروری اور محض کہانی میں تعلق بنانے کے لیے جنس کا اظہار کیا ہے ۔جنس کی مختلف صورتیں ہوتی ہیں لیکن رحمٰن عباس محض ناجائز جنسی تعلقات کو ہی اظہار کا ذریعہ بناتا ہے جس کے سبب یہ تعلق غیر فطری معلوم ہونے لگتا ہے ''روحزن'' میں اسرار کو ذہنی اور قلبی سکون ناجائز جنسی رشتوں میں نظر آتا ہے وہیں مس جمیلہ اور شانتی کے کردار بھی ہوس سے بھرے ہوئے نظر آتے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے یہ کردار جنسی تعلق کے لیے ہر پل تیار ہوتے ہیں ۔مصنف کہانی میں جس بھی تعلق کا ذکر کرتا ہے وہ تعلق جنس کے بغیر مکمل ہی نہیں ہوتا ہے یہاں کہانی میں جنسی گھٹن کے لیے ماحول کو پیدا کیا جاتا ہے اس کے بعد کردار اس ماحول کا حصہ بنائے جاتے ہیں یہ مصنف کی سب سے کمزور کڑی ہے جہاں واقعات کے تعلق اور توجہ مبذول کرانے کے لیے جنس کا سہارا لینا پڑتا ہے اتنا ہی نہیں روحزن اور ایک ممنوعہ محبت کی کہانی میں عورت اور اس کے وجود کو بے وفا قرار دیا گیا ہے ساتھ ہی مرد اور عورت کے درمیان محض ایک ہی تعلق کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کی جنس ایک فطری جذبہ ہے اور یہ تکمیل کے لیے خود اپنے راستے طے کرتا ہے لیکن ناول میں جس انداز سے اس کی تکمیل کے راستے بتائے گئے ہیں وہ فنی

نقطہ نظر سے ناقص ہیں اور روحزن کے کردار بھی اس مرحلے میں کمزور نظر آتے ہیں جہاں زندگی کی دیگر مصروفیات کے برعکس سارے کردار اپنی جنسی بھوک مٹاتے ہوئے نظر آتے ہیں یہاں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تخلیق کار کے نزدیک جنس کے علاوہ کوئی اور تعلق دنیا میں نہیں ہے نہ ہی فرد کے وجود اور شعور میں جنس کے سوا کچھ بھی ہے یہاں تک کہ انسان کا جانور کے ساتھ مباشرت کرنا اور بکری کو بیوی کی ہمشکل قرار دینا مصنف کے ناقص تجربے کو ظاہر کرتا ہے، ناول کا مطالعہ کرتے وقت مختلف مقامات پر ایسا محسوس ہونے لگتا ہے کہ مصنف کے سامنے کوئی بڑا تجربہ یا کوئی بڑا ویژن نہیں ہے۔ منٹو اور عصمت کی کہانیوں میں بھی جنس ہی جنس نظر آتا ہے لیکن ان کے یہاں جنس شہوت، لذت اور محض کہانی کو طول دینے کے لیے بیان نہیں ہوا ہے بلکہ اس کے پس پشت سنجیدگی اور وسعت نظر آتی ہے وہیں رحمٰن عباس کے ناولوں میں اس کی کمی صاف طور پر محسوس کی جاسکتی ہے ہاں اتنا ضرور ہے کی ناول زندیق میں انہوں نے عصر حاضر کے جنسی مسائل کو بڑے پیمانے پر دکھانے کی کوشش کی ہے یہاں مرد اور عورت کے جنسی تعلق کے بغیر بھی کئی اور تعلقات کو سامنے لایا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ مرد کا مرد سے تعلق اور عورت کا عورت سے تعلق ،عصر حاضر کی نئی جنسی کجروی کی طرف اشارہ کرتا ہے ساتھ ہی جنسی آلات سے جنسی تسکین کے جو نئے طریقے کھوجے جا رہے ہیں ان کا بھی اظہار نظر آتا ہے لیکن اس سب کے باوجود ان کے ناولوں میں جنس کسی صحت مند نظریے یا ویژن کا حصہ نہیں بن پایا ہے

بلکہ محض ایک تعلق کی صورت میں سامنے آیا ہے اگر چہ یہ تعلق کرداروں کے درمیان نہ پایا جاتا تب بھی مصنف بہتر ناول تخلیق کر پاتا لیکن رحمٰن عباس مذہب اور جنس کے بغیر لقمہ بھی نہیں توڑ پاتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جنسی موضوعات کے پیش کش میں ایک ہی طرح کا انداز سبھی نالوں میں نظر آتا ہے ان کے سبھی ناول ایک ایسی عورت کی جنسی نا آسودگی کا اظہار کرتے ہیں جس کی جنسی تسکین کے لیے اسے غیر مرد کے ساتھ تعلق بنانا پڑتا ہے ایک ممنوعہ محبت کی کہانی ،خدا کے سائے میں آنکھ مچولی اور روحزن میں یہی عورت نظر آتی ہے جو جنسی تسکین کے لیے غیر مرد کا سہارا لیتی ہے۔ ناول کے جدید منظر نامے کو سامنے رکھ کر یہ کہا جا سکتا ہے کہ رحمٰن عباس کے ناولوں میں جس طریقے سے جنسی کجروی، جنسی گھٹن اور جنسی نا آسودگی کا بیان ہوا ہے اس اعتبار سے ناول کمزور ہیں دراصل ان کے سبھی ناولوں میں جنسی موضوعات کی سطح پر بھی یکسانیت نظر آتی ہے جو قاری کو کھٹکتی ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ جنسی لطف اور لذت کے لیے یہ ناول نوجوان نسل کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب نظر آرہے ہیں لیکن سنجیدہ قاری اس یکسانیت سے اُکتا جاتا ہے۔

رحمٰن عباس کے ناولوں میں جنسی موضوعات کا اظہار اسی یکسانیت کے ساتھ ہوا ہے یہاں جنس ایک فطری جذبہ ہے۔نخلستان کی تلاش میں'' جمال کے ذریعے جنسی کشش کو بیان کیا گیا ہے۔ناول میں جمال کے کردار کو نئی تازگی مہوش بخشتی ہے جس سے لیٹ کر اس کی ساکت روح میں دھنک سی پھیل جاتی ہے۔لیکن یہاں جو

جنسی نا آسودگی جمال کے اندر نظر آتی ہے جس نے جمال کو عشق کے ایک نئے جذبات اور تجربے سے ہمکنار کرایا یہ وہی جذبات ہیں جو بدحال اور مایوس زندگی میں بہار لے آتے ہیں اور تلخی حیات میں تازگی بخشتی ہے۔ جمال جس کا سب کچھ لٹ چکا ہے اس کے ماں باپ کو قتل کیا گیا ہے وہیں اس کی بہن کی عصمت دری کی گئی ہے لیکن اس نظام کے خلاف اسے لڑنے کی ہمت نہیں بلکہ وہ فریدہ کو زندگی کی اُمید مان کر سب کچھ قبول کر لیتا ہے۔ ناول میں عبدالعزیز جس اتفاقی جنسی تجربہ کا شکار ہوا وہ اس سے زندگی بھر باہر نہیں آ پایا۔ رحمٰن عباس نے اس کردار کے ذریعے جہاں ایک طرف جنسی آسودگی کے سبب عمروں کے فاصلہ کوئی معنیٰ نہیں رکھنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ وہیں دوسری طرف سکینہ کے کردار کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ محبت کے لئے کوئی عمر مخصوص نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ کبھی بھی پروان چڑھ سکتی ہے یہاں مصنف نے اس بات کی طرف بھی صاف اشارہ کیا ہے کہ عورت کا محبت سے دامن بچانا مشکل ہے لیکن کیا سچ میں سکینہ کی محبت میں کوئی جواز تھا جس کا جواب یہی ہے کہ سکینہ ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہے۔ جس کے شوہر مجاور حسین تبلیغی جماعت سے جڑے ہوئے ہیں۔ باوجود اس کے وہ ایک نوجوان لڑکی کی زندگی برباد کر دیتی ہے یہ محبت نہیں بلکہ محض سکینہ کی جنسی ہوس ہے جو وہ کسی طرح سے مٹانا چاہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ناجائز بچے کو جنم دیتی ہے جو بڑا ہو کر اپنی ماں کے عاشق جو اس کا حقیقی باپ ہوتا ہے قتل کر دیتا ہے۔ ناول میں مذہبی شدت

پسندی اور مذہبی پیشواؤں پر بھی کھل کر طنز ہے۔

ناول روحزن میں جنسی موضوعات کو کھل کر پیش کیا گیا ہے۔ناول میں اسرار کے کردار کے ذریعے جنسی کجروی اور نفسیاتی الجھن کو صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ انہوں نے انسان کی ذہنی ،جنسی اور نفسیاتی الجھن کو پیش کیا ہے۔ناول کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ کس طرح جنسی کجروی زندگیوں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے۔لیکن وہیں دوسری طرف مصنف نے جنسی جذبے کو زندگی کا سب سے خوبصورت احساس بھی بتایا ہے۔جو فطری طور پر انسان میں قدرت نے ودیعت کر دیا ہوتا ہے۔لیکن اگر اسے غیر فطری طریقے سے عمل میں لایا جائے تو انسان جنسی گھٹن کا شکار ہوسکتا ہے۔ناول کا مرکز ممبئ ہے اور بمبئ کی زندگی میں جنسی ہی جنس ہے۔مرکزی کردار جس سے بھی روبرو ہوتا ہے وہ جنسی ہوس کی تکمیل کے لئے کوشش کرتا ہے۔یہاں شانتی کا کردار ایسی جنسی کجروی کا شکار ہو کر طوائف بن جاتی ہے۔دراصل شانتی کو اس کا ماما پونہ لے آتا ہے جہاں وہ اس کا جنسی استحصال کرنے لگتا ہے آخر کا شانتی اس جنسی نا آسودگی اور مجبوری کے سبب طوائف بن جاتی ہے۔

مختصر طور پر کہا جاسکتا ہے کہ رحمٰن عباس کے ناولوں میں مذہبی کٹر پن ،مذہبی انتہا پسندی اور جنسی کجروی جیسے موضوعات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ان کے ناولوں میں یہ دونوں موضوعات اساسی حیثیت رکھتے ہیں۔برصغیر میں مذہب سے پنپنے والے مسائل جس طریقے سے انسان کے لیے خطرہ بن رہے ہیں

وہیں دوسری طرف جنسی گھٹن ،جنسی کجروی اورنفسیاتی الجھن انسان کو بے راہ روی کی طرف لے جا رہے ہیں۔مصنف نے زبان و بیان کے عمدہ نمونے پیش کیے ہیں وہیں کوکن اور ممبئی کی تہذیبی زندگی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس تہذیب میں جہاں مذہب کواولیت حاصل ہے وہیں جنس بھی اس تہذیب میں اساسی حیثیت رکھتا ہے۔

حوالہ جات

۱۔ تنقیدی جائزے، احتشام حسین، اتر پردیش اردو اکیڈمی، ۲۰۱۴، ص۔۱۵۰

۲۔ نذیر احمد کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر اشفاق محمد خان، اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ، ۲۰۰۷

۳۔ بحوالہ خالد اشرف، معاصر پاکستان ناول ایک اجمالی جائزہ۔ مشمولہ ہم عصر اردو ناول ایک مطالعہ، مرتبہ قمر رئیس، علی احمد فاطمی، ایم آر پبلیکیشنز ۲۰۰۷ ص، ۱۲۱، ۱۲۲

۴۔ نخلستان کی تلاش، رحمٰن عباس، خزانہ پبلی کیشنز نئی دہلی ۲۰۰۴،

۵۔ نخلستان کی تلاش میں، رحمٰن عباس، خزانہ پبلی کیشنز نئی دہلی، ۲۰۰۴ ص، نمبر ۴۶ ۴۵

۶۔ تین ناول۔ رحمان عباس، مشمولہ ایک ممنوعہ محبت کی کہانی، صفحہ نمبر ۳۴۳

۷۔ عنبر بلال صفحہ نمبر ۵۷

۸۔ ایک ممنوعہ محبت کی کہانی، رحمٰن عباس، ایجوکیشنل پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۰۹

۹۔ ایضاً۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ص ۷۷

۱۰۔ اردو مثنویوں میں جنسی تلذذ، ڈاکٹر محبوب اعلی قریشی،، تخلیق کار پبلشرز نئی دہلی ۱۹۹۳، ص ۱۵۲ ۱۵۱

کتابیات

بنیادی ماخذ

مصنف/مرتب	کتاب کا نام	ناشر	سنہ اشاعت
رحمٰن عباس	نخلستان کی تلاش	خزانہ پبلی کیشنز نئی دہلی	۲۰۰۴
ایضاً۔	ایک ممنوعہ محبت کی کہانی	ایجوکیشنل پبلی کیشنز دہلی	۲۰۰۹
ایضاً۔	خدا کے سائے میں آنکھ مچولی	عرشیہ پبلی کیشنز دہلی	۲۰۱۱
ایضاً۔	روحزن	ایضاً	۲۰۱۶
ایضاً۔	زندیق	ایضاً	۲۰۲۱

ثانوی ماخذ

مصنف	کتاب کا نام	ناشر	سنہ اشاعت
۱۔ (ڈاکٹر) اسلم آزاد	اردو ناول آزادی کے بعد ڈاکٹر	دی لکشمی پرس نئی دہلی	۱۹۹۰ء
۲۔ (ڈاکٹر) اسلم آزاد	عزیز احمد بحیثیت ناول نگار	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۰۸ء
۳۔ (ڈاکٹر) افسانہ پروین	اردو کے نمائندہ ناولوں میں مسلم خواتین کی تصویر کشی	پرنٹرس دہلی	۲۰۱۵ء
۴۔ (ڈاکٹر) ایم عظیم اللہ	متعلقاتِ فکشن	ایجوکیشنل پبلیشنز ہاوس دہلی	۲۰۱۸ء
۵۔ (ڈاکٹر) اشفاق محمد خان	نذیر احمد کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ	اتر پردیش اردو اکیڈمی لکھنؤ	۲۰۰۷
۶۔ انور پاشا	ہندو پاک میں اردو ناول کا تقابلی مطالعہ	پیش رو پبلی کیشنز نئی دہلی	۱۹۹۲ء
۷۔ آل احمد سرور	اردو فکشن	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۷۰ء
۸۔ آل احمد سرور	اردو فکشن	اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنو	۱۹۸۹
۹۔ آل احمد سرور	اردو فکشن	اردو پبلشرز نظیر آباد لکھنو	۱۹۸۹
۱۰۔ ابن کنول	اردو افسانہ	کتابی دنیا نئی دہلی	۲۰۱۱
۱۱۔ (ڈاکٹر) جمیل جالبی	تاریخ ادبِ اردو	مسلم ایجوکیشنل ہاؤس علی گڑھ	۱۹۸۷ء
۱۲۔ (ڈاکٹر) خالد اشرف	برصغیر میں اردو ناول	کاک آفسیٹ پرنٹرس دہلی	۲۰۰۳ء

۱۳۔ (ڈاکٹر) ریاض احمد	ترقی پسند تحریک اور اردو ناول	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی	۲۰۰۷ء
۱۴۔ رام لال	اردو افسانے کی نئی تکنیکی فضا	سیمانت پرکاشن دہلی	۲۰۱۲
۱۵۔ رحمٰن عباس	اکیسوں صدی میں اُردو ناول	عریشیہ پبلی کیشنز نیو دہلی	۲۰۱۴ء
۱۶۔ سنبل نگار	اردو نثر کا تنقیدی مطالعہ	ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس علی گڑھ	۲۰۰۹
۱۷۔ شہباز مرزا	قرۃ العین حیدر کی ناول نگاری	نظامی پریس لکھنؤ	۱۹۸۹ء
۱۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی	افسانے کی حمایت میں	مکتبہ جامعہ لمٹڈ نئی دہلی	۲۰۰۶
۱۹۔ (پروفیسر) صغیر افراہیم	اردو کا افسانوی ادب	مسلم ایجوکیشنل ہاؤس علی گڑھ	۲۰۱۰ء
۲۰۔ ضیا اعظم آبادی	ادب اور جنس	اردو پبلشرز نذیر آباد لکھنو	۱۹۸۹
۲۱۔ (پروفیسر) ظہورالدین	کہانی کا ارتقاء	انٹرنیشنل اُردو پبلیکیشنز دریا گنج، دہلی	۱۹۹۹ء
۲۲۔ (پروفیسر) عبدل السلام	بیسویں صدی میں اردو ناول	اعجاز پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۲۳۔ علی حید ملک	افسانہ اور علامتی افسانہ	عاکف بک ڈیپو مینا محل دہلی	۱۹۹۹
۲۴۔ (پروفیسر) عبدل السلام	عصمت چغتائی اور نفسیاتی ناول	اعجاز پبلشنگ ہاوس دریا گنج، نئی دہلی	۱۹۸۹ء
۲۵۔ (ڈاکٹر) عبدالسلام صدیقی	کرشن چند کے ناولوں کا تنقیدی مطالعہ	انجمن ترقی اردو ہند	۲۰۰۴ء
۲۶۔ (ڈاکٹر) غلام محی الدین انصاری	ہندو پاک کی خواتین ناول نگار	شاہد پبلی کیشنز نیو دہلی	۲۰۰۸ء
۲۷۔ فردوس فاطمہ	مختصر افسانہ کا فنی تجزیہ	انجمن ترقی اردو ہند دہلی	۱۹۷۵
۲۸۔ (پروفیسر) قمر رئیس	ہم عصر اردو ناول	ایم۔آر۔پبلی کیشنز دہلی	۲۰۰۷ء
۲۹۔ (پروفیسر) قمر رئیس	پریم چند کا تنقیدی مطالعہ بحیثیت ناول نگار	ایم۔آر۔پبلی کیشنز دہلی	۲۰۰۹ء
۳۰۔ گل صبا	ابتدائی تین ناول ایک مطالعہ	شاہد پبلی کیشن ہاؤس دہلی	۲۰۰۹ء
۳۱۔ مرزا خلیل احمد بیگ	اردو کی لسانی تشکیل	مسلم ایجوکیشنل ہاؤس علی گڑھ	۲۰۱۰ء
۳۲۔ (ڈاکٹر) مہ جبین	کرشن چندر کی ناول نگاری اور نسوانی کردار	مارڈن پبلشنگ یاؤس دہلی	۲۰۰۸ء
۳۳۔ (ڈاکٹر) ممتاز احمد خان	آزادی کے بعد اردو ناول	انجمن ترقی اردو پاکستان	۱۹۹۷ء
۳۴۔ مجنوں گورکھپوری	ادب اور زندگی	اردو گھر علی گڑھ	۱۹۶۵
۳۵۔ (ڈاکٹر) محبوب اعلی قریشی	اردو مثنویوں میں جنسی تلذز	تخلیق کار پبلشرز نئی دہلی	۱۹۹۳
۳۶۔ (ڈاکٹر) محمد نوشاد	اردو فکشن میں تصور وقت	عفیف پرنٹرس دہلی	۲۰۱۲ء

۳۷۔ (ڈاکٹر) منصور خوشتر	اردو ناول کی پیش رفت	ایجوکیشنل پبلیشنز ہاؤس دہلی	۲۰۱۷ء
۳۸۔ (ڈاکٹر) نیلم فرزانہ	عصر ادب کی اہم خواتین ناول نگار	ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ	۱۹۹۱ء
۳۹۔ نگہت ریحانہ خان	اردو افسانے کا فنی و تکنیکی مطالعہ	کلاسیکل پرنٹرز چاوڑی بازار دہلی	۱۹۸۶
۴۰۔ وارث علوی	فکشن کی تنقید کا المیہ	جے کے آفسٹ پریس جامعہ مسجد نئی دہلی	۱۹۹۲
۴۱۔ (ڈاکٹر) یوسف سرمت	بیسویں صدی میں اردو ناول	انجمن ترقی اردو ہند	۱۹۹۵ء

رسائل و جرائد

	رسالے کا نام	ناشر	سنِ اشاعت
۱۔	جہانِ اردو	محلّہ رحم گنج پوسٹ لال باغ دربھنگہ	۲۰۱۲ء
۲۔	اردو دنیا	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	۱۸۔۲۰۱۷ء
۳۔	ایوانِ اردو	اردو اکادمی دہلی	۲۰۱۸ء
۴۔	فکر و تحقیق (سہ ماہی)	قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان	اپریل تا جون/۲۰۱۶ء
۵۔	تسلسل	شعبۂ اردو جموں	۱۲۔۲۰۱۱ء
۶۔	بے لاگ	اقبال آباد بوج پورہ سرینگر	نومبر/۲۰۱۵ء
۷۔	بازیافت	شعبۂ اردو کشمیر یونیورسٹی	۲۰۰۶ء
۸۔	تہذیب الاخلاق	علی گڑھ	نومبر ۲۰۱۷ء
۹۔	تحریکِ ادب	بنارس	اگست ۲۰۱۷ء

سبق اردو

جنوری، ۲۰۲۱

ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر: ڈاکٹر محمد سلیم | سرنامہ: عادل منصوری | جلد: ۵ | شمارہ: ۱۰

موبائل:9696486386 | سرورق: دانش الہ آبادی | Net Banking:SABAQ -E-URDU(MONTHLY)

واٹس ایپ:9919142411 | کمپوزنگ: دانش الہ آبادی، اہل قلم | IFSC BARB 0 GOPI BS A/C28240200000214

sabaqeurdu@gmail.com | مطبع: عظیم انڈیا پریس، گوپی گنج، بھدوہی | Bank of Baroda, Branch: Gopiganj

فی شمارہ: -/100، زرتعاون:-/1000 | زرتعاون خاص:-/2000، اعزازی تعاون:-/5000 | Gopiganj-221303,Dist.Bhadohi,UP,INDIA

چیف ایڈیٹر

ڈاکٹر دانش الہ آبادی

دارآواز میں جہاں آمریت کے خلاف بھرپور جدوجہد کی وہاں قلم اور لفظ کو حرمت کی پاسداری کرتے ہوئے اس کے ضامن بھی بنے۔ان کی غیر موجودگی میں ان کی نثر، شاعری، خطبات آج بھی زندہ ہیں ان کی شعلۂ بیانی آج بھی مستقبل کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔جب تک قلم اور کاغذ کا رشتہ ہے تب تک آغا شورش کاشمیری زندہ ہے۔

☆☆☆☆

ریسرچ اسکالر
شعبۂ اردو جموں یونی ورسٹی
رابطہ: yasirarfat3309@gmail.com

روحزن: فکشن کی نئی قرأت

پرتاپ سنگھ

اکیسویں صدی میں اُردو ادب بالخصوص اُردو ناول کے میدان میں کچھ ایسے فن پارے وجود میں آئے جو ایک طرف مصنف کی شہرت کا سبب بنے تو وہیں دوسری طرف سماج میں ان فن پاروں کو متنازعہ قرار دیا گیا۔دراصل یہ فن پارے سماج کے ان پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتے ہیں جن کو شجرِ ممنوعہ سمجھا جاتا ہے اور اس شجر ممنوعہ پر لب کشائی کرنے والوں میں عصر حاضر کے ایک اہم ناول نگار رحمٰن عباس کا نام بھی شامل ہے ۔رحمٰن عباس ایک ایسا ناول نگار ہے جس کے ناولوں پر اعتراضات ہوتے رہے ہیں خواہ بات ان کے ناول 'ایک ممنوعہ محبت کی کہانی' ہو یا ''خدا کے سائے میں آنکھ مچولی کی، لیکن باوجود اس کے رحمٰن عباس کا قلم نہیں ٹھہرا بلکہ نڈر ہو کے مسلسل لکھتے رہے بیگ احساس کے مطابق اگر رحمٰن عباس کے علاوہ کوئی کمزور اعصاب والا ادیب ہوتا تو لکھنا چھوڑ دیتا۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ردو قبول کی پرواہ کیے بغیر ''روحزن'' جیسا ناول تخلیق کیا دراصل ''روحزن'' رحمٰن عباس کی اختراع کی ہوئی اصطلاح ہے جس کے متعلق وہ ناول کے اختتام پر یوں لکھتے ہیں:

''روح اور حزن کی آواز نیز ان لفظوں کے معنی 'لفظ 'روحزن'' کی تشکیل کے وقت میرے ذہن میں تھے لیکن اس لفظ کو روح اور حزن کا مرکب نہ سمجھا جائے۔روحزن، بہ طور سالم لفظ ایک ذہنی، جذباتی اور نفسیاتی صورت حال کو پیش کرتا ہے ناول اُس کیفیت کی پیش کش کے ساتھ ایک نئے لفظ کو صورت عطا کرنے کی کوشش ہے۔''

(رحمٰن عباس، روحزن، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص نمبر۔۳۵۵)

رحمٰن عباس کا یہ ناول فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا ہے اور ناول کا آغاز بھی ناول کے مرکزی کردار اسرار اور حنا کی زندگی کے آخری دن سے ہوتا ہے ناول کا پہلا جملہ ''اسرار اور حنا کی زندگی کا وہ آخری دن تھا۔''ناول کے پہلے جملے سے ہی مایوسی کی کیفیت قاري پر طاری ہوجاتی ہے اور یہ جملہ قاری کے اندر اسرار اور حنا کے متعلق جاننے کی تجسس پیدا کر دیتا ہے۔اس کے بعد ناول کی پرت در پرت کھلنی شروع ہوجاتی ہے۔ناول 'روحزن' کو مصنف نے آٹھ ابواب میں تقسیم کیا ہے اور ہر باب کا آغاز اردو کے مشہور شاعر بانی کے شعر کے مصرعہ سے ہوتا ہے۔ ''روحزن''، رحمٰن عباس کا ایک ایسا ناول ہے۔جو اپنے اندر معنی کی گہرائی رکھتا ہے۔ جس میں انسانی زندگی کی ذہنی، جنسی اور جذباتی کشمکش نے ایک ایسی صورت اختیار کی ہوئی ہے جس سے عصر حاضر کا انسان شعور اور لاشعور میں پنپنے والے کرب کو جھیل رہا ہے۔

رحمٰن عباس کے اس ناول میں جنسی اور نفسیاتی کشمکش کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہے۔اور مصنف قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں کامیاب نظر آتا ہے۔دراصل جنس ایک فطری عمل ہے لیکن زیر بحث ناول میں اس جنس کی تشنگی کو ہر کردار کے اندر محسوس کیا جا سکتا ہے۔مس جمیلہ سے لے کر ناول کا ہر کردار اس تشنگی میں ڈوبا نظر آتا ہے۔دراصل انسان کی بے وفائی کی سب سے بڑی وجہ بھی کسی

نہ کسی طرح جنس کو ہی بتایا گیا ہے جو اپنی تکمیل کے لئے مذہب، ذات، رنگ اور نسل سب بھول جاتا ہے لیکن اس بے وفائی میں صرف عورت نہیں بلکہ مرد بھی شامل دکھائی دیتا ہے۔ناول میں اسرار جب محمد علی کی ماں کا قصہ سنتا ہے تو وہ عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

"وہ گھر سے نکلا تو اس کا دل بجھا ہوا تھا۔اُس کے قدم آہستہ آہستہ جمیلہ مس کے گھر کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اُس کا دل بار بار اس سے پوچھ رہا تھا کہ 'آدمی بے وفائی کیوں کرتا ہے؟'۔"

(رحمٰن عباس، روحزن، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص نمبر۔۱۱۶)

لیکن جب اسرار مس جمیلہ کے گھر پہنچ جاتا ہے اور اس کے ساتھ رات گزارتا ہے تو اس کی کشمکش کچھ کم ہوتی ہے۔اُسے محسوس ہوتا ہے کہ جس بے وفائی کا سوال وہ خود سے کر رہا ہے دراصل وہ خود بھی اس بے وفائی میں شریک ہے۔مس جمیلہ کے ساتھ اس کے جنسی تعلقات اور مس جمیلہ کا اپنے شوہر کے ساتھ بے وفائی پر غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ

"بے وفائی انسان کی فطرت ہے، بلکہ فطرت کا سب سے اہم عنصر بھی ہے۔"

(رحمٰن عباس، روحزن، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص نمبر۔۱۱۷)

پلاٹ کے اعتبار سے رحمٰن عباس کا یہ ناول اہم ہے۔ناول میں بہت سارے واقعات ہونے کے باوجود بھی اس کا پلاٹ گٹھا ہوا اور مضبوط ہے اور اس میں جو واقعات پیش کئے گئے ہیں انہیں نہایت سلیقے کے ساتھ برتا گیا ہے۔ناول کا پلاٹ ممبئی کے سماجی زندگی کے ارد گرد طواف کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ممبئی دراصل ایک ایسا مقام ہے جہاں ہر انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے آتا ہے اور جنہیں پورا کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔اسرار اور مس جمیلہ کی کہانی کے بعد ممبئی میں شانتی طوائف اور پھر حنا سے ملاقات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔حنا سے ہی اس کے والد یوسف اور ایمل کی زندگی پر روشنی پڑتی ہے یہاں کہانی ایک نیا رنگ لیتی ہے اور ایک ایسے طبقے سے روشناس کراتی ہے جو آزاد ذہن کے مالک ہیں جو سماج کے بندھے ٹکے اصولوں کی پروا کئے بغیر خود کو آزاد رکھنا چاہتے ہیں یہاں مذہب کے اصولوں پر بھی کھل کر تنقید دیکھنے کو ملتی ہے۔اس کے بعد پھر کہانی اسرار اور حنا کی طرف لوٹ آتی ہے اور آخر میں دونوں کی موت پر یہ ناول ایک المیہ پر ختم ہوتا ہے۔

ناول "روحزن" میں مصنف نے جتنے بھی واقعات کو پیش کیا ہے اور ان واقعات کی کوکھ سے جتنی بھی کہانیوں نے جنم لیا ہے ان میں کوئی بھی غیر ضروری واقعہ معلوم نہیں ہوتا ہے، ہاں اس میں کوئی شک نہیں کہ کہیں کہیں مصنف نے دقیق اور گہری فلسفیانہ بحث چھیڑ کر عام قاری کے لئے کہانی کو کچھ لمحے کیلئے بوجھل بنا دیا ہے لیکن دوسرے ہی لمحے قاری خود کو اس بوجھ سے الگ ہوتا ہوا محسوس کرتا ہے۔یہاں یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ ناول میں جتنے بھی واقعات شامل ہوئے ہیں تمام واقعات کسی نہ کسی سطح پر آ کر ایک ہی شئے میں ضم ہو جاتے ہیں اور یہ شئے مرد اور عورت کا وہ جسمانی جذبہ ہے جو جنسی جذبے میں آخر کار منتقل ہو جاتا ہے لیکن یہ جنس کس طرح بے راہ روی کی طرف انسان کو لے جاتا ہے اس کی منفی تصویر بھی ناول میں دیکھنے کو ملتی ہے۔

"ہوا یوں تھا کہ پڑوس کے ایک گاؤں میں واقع، مدرسہ اہل عبث الفرجاء البلادات العربیہ، کا ایک معلم مدرسے کے پیچھے کی جھاڑیوں میں ایک سفید رنگ کی بکری کے ساتھ مباشرت کرتے ہوئے رنگے ہاتھوں پکڑا گیا تھا۔جب پنچایت میں اس سے پوچھا گیا کہ وہ ایسی مذموم حرکت کیوں کر رہا تھا تو اُس کا جواب تھا، بکری میری مرحوم اہلیہ کی ہم صورت ہے۔مجھے ایسا لگتا ہے میری بیوی کی روح بکری میں حال گزیں ہے۔"

(رحمٰن عباس، روحزن، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص نمبر۔۱۰۳)

مندرجہ بالا اقتباس سے انسان کی حیوانیت کی وہ تصویر دیکھنے کو ملتی ہے جس میں جنس کا جذبہ اس قدر سرایت کر جاتا ہے کہ وہ انسان اور جانور میں فرق کرنا بھول جاتا ہے۔یہاں جنس، جنس نہیں رہتا ہے اور انسان، انسان نہیں بلکہ ایسی صورت میں انسان کی وہ بے ضمیری سامنے آتی ہے جس کے لئے اُسے پیدا نہیں کیا گیا ہے بلکہ اشرف المخلوقات کا درجہ دے کر اسے کائنات کی سب سے بہترین اور اعلیٰ تخلیق تصور کیا جاتا ہے۔

رحمٰن عباس کے اس ناول میں کردار نگاری کے بھی اعلیٰ ثبوت دکھائی دیتے ہیں ناول کے مرکزی کرداروں میں اسرار اور حنا قابل تعریف ہیں۔ان کے علاوہ دیگر کرداروں میں یوسف میمن، مس جمیلہ، درخشاں، محمد علی، بوراشد، وردۃ السعادۃ، شانتی، اسلم، موسیٰ بھائی، مادھوری، عثمان وغیرہ شامل ہیں۔ناول کے مرکزی کردار اور ضمنی کردار ناول کی بنت کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔اسرار کا کردار ایک ایسے نوجوان کا کردار ہے جو قدم در قدم ازلی محبت کا متلاشی نظر آتا ہے آخر میں مصنف نے جس موڑ پر لا کر کہانی کو ختم کیا اُس ایسے سے کسی حد تک اس کردار نے قاری کی ہمدردی حاصل کی ہے۔اسرار کا کردار عصر حاضر کے اس نوجوان طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو ایک طرف بے روزگاری میں مبتلا ہے تو دوسری طرف جنسی اور ذہنی کشمکش میں۔ناول کا دوسرا کردار حنا کا ہے یہ نسوانی کرداروں میں سب سے زیادہ فعال و متحرک دکھائی دیتا ہے اس کردار میں جو ذہنی تبدیلی رونما ہوتی ہے وہ دراصل اس کے باپ یوسف میمن کی وجہ سے آتی ہے اور یہ کردار اپنے باپ کی طرح آزادانہ زندگی گزارنے کے حق میں دیکھائی دیتی ہے۔اسرار سے اس کی محبت اور پھر اس محبت کے انجام نے قاری کو کہانی کے آخر میں پہنچا کر ایک ایسے ماحول میں دھکیل دیا جہاں پہنچ کر قاری اسرار اور حنا سے ہمدردی کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

ناول کے دیگر نسوانی کرداروں میں ایمل، درخشاں، ودی اور مس تھامس، شانتی، کا بھی ہے۔ایمل ایک ایسا نسوانی کردار ہے جو بہت امیر ہے اس کا شوہر کاروباری ہے اور عرب سے جب یہ ہندوستان آتے ہیں تو یوسف میمن کے ساتھ ان کی ملاقات ہو جاتی ہے یہ آزاد طبیعت کی عورت ہے جس میں جنسی تشنگی بھری ہوئی ہے ساتھ ہی یہ اچھی طرح سے جانتی ہے کہ یوسف جیسے کردار کا کہاں کب اور کیسے استعمال کرنا ہے۔یہ ایک تجربہ کار عورت ہے اور یوسف میمن کے ساتھ اس کے جنسی تعلقات اور ذہنی خیالات نے یوسف میمن کو ایک نئی ڈگر پر پہنچا دیا ایک ایسی ڈگر جس پر چل کر اس نے اپنی بیوی درخشاں کو بھی چھوڑ دیا۔نسوانی کرداروں میں ایمل کا کردار سب سے زیادہ پڑھا لکھا ہے جو ہر موضوع پر یوسف کے ساتھ بات کر لیتی ہے اور دھیرے دھیرے اپنے خیالات بھی یوسف کے ذہن میں ڈال دیتی ہے جس کو اپنا کر یوسف ہر ایک موضوع پر اپنی بیٹی کے ساتھ کھل کر بات کرتا ہے۔

ناول "روحزن" مکالمہ نگاری کے بہترین نمونے فراہم کرتا ہے۔ناول میں اسرار اور مس جمیلہ کے مکالمے ہوں۔منظر نگاری کے حوالے سے بھی یہ ایک

کامیاب ناول ہے۔ناول میں ممبئی شہر کی منظر نگاری ہو یا کسی تاریخی مقام کی، گاؤں کی ہو یا سمندر میں چل رہی کشتی کی، فٹ پاتھ کی زندگی ہو یا پھر کھولی میں رہنے والے لوگوں کی، دراصل کسی بھی جگہ یا واقعے کا منظر کیوں نہ ہو رحمٰن عباس نے اسے اس طرح کھینچا ہے کہ قاری کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنی آنکھوں سے ان مناظر کو دیکھ رہا ہے ۔ناول کے آغاز میں ہی منظر نگاری کا بہترین ثبوت دیکھنے کو ملتا ہے دراصل مصنف نے ناول کے آغاز میں ہی ممبئی شہر کا بارش کے بعد جو نقشہ کھینچا ہے وہ قابل توجہ ہے۔

''ممبئی کے اطراف پھیلا ہوا سمندر بہت طیش میں تھا۔وہ صدیوں سے جاری جنگ کو جیت کر جزیرے پر قبضہ کر لینا چاہتا تھا۔اونچی اونچی لہریں اُٹھ رہی تھیں اور ساحلوں پر غصے میں اپنا سر پٹخ رہی تھی۔لہریں اس طرح سر اُٹھا رہی تھیں جیسے اُٹھ کر آسمان کو چھونا چاہتی ہوں۔ان سرکش لہروں کو دیکھ کر ہیبت طاری ہو رہی تھی۔تین دنوں سے شہر میں بارش جاری تھی اور اب تو شہر کی شاہراؤں، کشادہ سڑکوں اور تنگ و تاریک گلیوں میں بھی گھٹنوں گھٹنوں پانی جمع ہو گیا تھا۔آسمان میں سوائے کالے بادلوں کے کوئی شئے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔شہر بھول گیا تھا سورج کی کرنیں کیسی ہوتی ہیں۔ آسمان میں چھید تھے جہاں سے ڈھار ڈھار پانی گر رہا تھا۔گویا آسمان میں بادل نہیں آبشار تھا۔سمندر کا پانی زیر زمین نالیوں میں بہت اندر تک سرایت کر چکا تھا۔بارش کے پانی کی نکاسی رک گئی تھی۔ بڑی بڑی نالیوں میں سمندر اور بارش کے پانی میں کشا کش جاری تھی جس کے سبب نالیوں کی کنکریٹ کی دیواریں ٹوٹ پھوٹ رہی تھیں اور مخلوط پانی زمین کی اندرونی پرتوں میں پھیلتا جا رہا تھا۔''

(رحمٰن عباس، روحزن، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص نمبر۔۱۱)

اس کے علاوہ بھی مختلف مقامات پر جو منظر کشی کی گئی ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو اس فن پر بھی دسترس حاصل ہے۔ممبئی کی کھولی کے آس پاس سنڈاس سے مصنف کو گہری واقفیت تھی۔دراصل مصنف نے ناول میں جس کسی واقعے کا بھی نقشہ کھینچا ہے اس کی پرت در پرت کھول کر رکھ دی ہے۔یہ تب ہی ممکن ہوتا ہے جب خود مصنف کو اس طرح کے تجربات سے دو چار ہونا پڑا ہو صرف تخیل پروازی سے ہی اختراع نہیں ہو سکتی ہے۔

ناول ''روحزن'' کی زبان سادہ، سلیس اور شگفتہ ہے اگر چہ ناول میں متعدد زبانوں کے الفاظ شامل ہوئے ہیں جن میں ہندی، مراٹھی، انگریزی، گجراتی اور علاقائی بولیوں کے الفاظ شامل ہیں لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ کہیں بھی قاری ان الفاظ کے استعمال سے بوجھل نہیں ہوتا۔ انگریزی کے علاوہ ہندی کے متعدد الفاظ جسے سمبھوگ، سنیچر علاوہ ازیں سنسکرت کے الفاظ برہمانڈ، راکسش اور سادھی وغیرہ استعمال کیے ہیں۔رحمٰن عباس نے استعارات اور تشبیہات کا سہارہ لے کر بھی بڑے خوبصورت انداز میں اپنی بات بیان کی ہے اور متعدد جگہوں پر ناول میں تشبیہات کے نمونے دیکھنے کو ملتے ہیں۔

''پہاڑوں کا رنگ کہیں سوکھی ہوئی ہلدی جیسا تھا تو کہیں پیاز کے چھلکوں کی رنگت اختیار کئے ہوئے تھا''۔

(رحمٰن عباس، روحزن، عرشیہ پبلی کیشنز دہلی، ص نمبر۔۲۱۲)

رحمٰن عباس کا ناول ''روحزن'' اپنے اندر بے شمار پہلوں کو سمیٹے ہوئے اور ہر پہلو اپنے اندر کئی کہانیاں رکھتا ہے۔یہ ناول اکیسویں صدی میں ابھرنے والے ذہنی، جنسی اور نفسیاتی کشمکش کا عکاس ہے۔ناول نگار نے ممبئی کی اس زندگی سے بھی روشناس کرایا ہے جو اسرار، محمد علی، فٹ پاتھ پر زندگی گزارنے والی بھکارن کے ساتھ ساتھ یوسف میمن جیسے لوگ بھی ہیں جو اپنے طریقے سے زندگی گزارتے ہیں۔یہاں ہر طرف چہل پہل ہے ہر شخص دوڑ دھوپ میں لگا ہوا ہے لیکن ہر کردار کسی نہ کسی طرح نفسیاتی اور جنسی کشمکش میں مبتلا دکھائی دیتا ہے۔گاؤں سے آیا ہوا اسرار بھی اس کا حصہ بن جاتا ہے اور شانتی کے ساتھ ساتھ حنا کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرتا ہے لیکن یہاں محمد علی، حنا، اسرار اور شانتی جیسے کردار دکھائی دیتے ہی جن کے ذہن و دل پر گہرا زخم ہے۔ناول کے عنوان کو مدنظر رکھتے ہیں لفظ ''روحزن'' کا یہ مطلب ہے کہ جب کوئی انسان اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کو دوسرے کے ساتھ جنسی تعلق قائم کرتے دیکھ لیں تو ان کی روح میں عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے تو اسرار، شانتی، حنا اور محمد علی جیسے کرداروں پر جو گھاؤ ہے جو کیفیت ہے وہ اسی وجہ ہے کہ ان میں ہر ایک نے اپنے ماں باپ میں سے کسی ایک کو دوسرے کسی کے ساتھ صحبت کرتے ہوئے دیکھا تھا۔اسرار نے اپنی ماں کو چچا کے ساتھ، حنا نے اپنی ماں درخشاں کو پیر کے ساتھ، شانتی نے اپنی ماں کو عریاں حالت میں اپنے پڑوسی کے ساتھ تو وہیں محمد علی نے اپنی ماں کو اس شخص کے ساتھ جس کے ساتھ وہ محمد علی اور شوہر کو چھوڑ کر بھاگ گئی۔ دراصل ان تمام کرداروں پر جو ذہنی اور نفسیاتی کشمکش دکھائی دیتی ہے اس کے سوتے کسی نہ کسی طرح ان دھاروں سے بھی پھوٹتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ناول میں مصنف نے مذہب کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے اور ساتھ ہی مذہب پرست لوگوں کو بھی، یہاں غور طلب بات یہ بھی ہے کہ متعدد جگہوں پر مصنف نے مذہبی کٹر سوچ پر طنز کیا ہے۔پھر مولوی کا بکری کے ساتھ مباشرت کرنا ہو یا بابا علی کی درگاہ کے باہر صوفی پیر کا درخشاں کے ساتھ تعلقات، یہ وہ واقعات ہیں جو ظاہری مذہبی لبادے میں رہ کر گناہ اور جرم کو انجام دیتے ہیں اس مقام پر ناول نگار نے ان کے قول و فعل کے تضاد کو نمایاں کیا ہے۔مصنف نے ایمل اور یوسف کے ذریعے شیطان کا بھی ذکر کیا ہے اور ایمل دلائل کے ساتھ یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ابلیس غلط نہیں تھا بلکہ محض ایک سجدہ نہ کرنے پر ہی اُسے جنت سے نہیں نکالا گیا بلکہ اس کے پیچھے ایک بہت بڑی وجہ تھی، وہیں ایمل خدا کے لئے بھی کچھ ایسے متنازعہ جملے استعمال کرتی ہے جو ناول کا رُخ کسی اور طرف موڑ دیتے ہیں۔ناول میں ایمل کے ذریعے یوسف کے خیالات میں تبدیلی اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نئی نسل آزاد طبیعت کی ہے اور بندھے ٹکے اصولوں کی پروا کیے بغیر وہ ان مذہبی اور سماجی حدوں کو پار کر کے آزاد رہنا پسند کرتی ہے۔

رحمٰن عباس کا یہ ناول ممبئی میں ہوئے دہشت گردوں کے حملوں کی بھی ترجمانی کرتا ہے اور ناول میں مندروں اور مسجدوں کے میناروں کو دیکھنے کے بعد اسے خیال آتا ہے کہ یہ مندر کے کلس اور مسجد کے مینار نہ جانے کتنے حادثات، فسادات اور قتل و غارت کے شاہد ہیں۔اتنا ہی نہیں ناول میں بابری مسجد کے انہدام کے بعد جو فسادات ہوئے کس طرح انسان نے وحشی کا روپ اختیار کر کے ایک دوسرے کو مذہب کے نام پر مارنا شروع کیا ''واگھ مارے کا موسی کو ریپش'' کہہ کر پکارنا اس بات کی صاف علامت ہے کہ مسلمان نام ہونا یا ہندو نام ہونا کسی ایسی جگہ پر جہاں کسی بھی گروہ کی اکثریت زیادہ ہو جان بحق ہونے کے لئے کافی ہے ۔ناول نگار نے متعدد جگہوں پر اقلیتوں پر ہو رہے ظلم کی بھی عکاسی کی ہے ساتھ ہی ان

تمام حادثات اور واقعات کا بھی ذکر کیا ہے جو وقتاً فوقتاً ممبئی پر ہوئے ،ممبا دیوی کا پریشان ہونا اس بات کی علامت ہے کہ ممبئی شہر پر آفتیں آتی رہیں گی اور برہما کی ممبا دیوی سے ممبئی کے مستقبل کے خطرے سے واقف کرانا دراصل دور حاضر کی طرف اشارہ ہے جس میں وقتاً فوقتاً کئی برسوں سے ممبئی میں حملے ہوتے رہے ہیں ۔ناول میں ممبئی کی فٹ پاتھ کی زندگی کو بھی موضوع بنایا گیا ہے اور اس فٹ پاتھ پر رہنے والے لوگ کس طرح جنس میں مبتلا ہیں اس کی مثال اس بھکارن لڑکی سے ملتی ہے جو حنا اور ودی سے کہتی ہے کہ اس کا باپ کئی برسوں سے اس کا جنسی استحصال کرتا آ رہا ہے اور اس کی ماں کسی دوسرے مرد کے ساتھ ہوتی ہے ۔یہاں قاری کی روح لرز جاتی ہے اور ایک ایسے مقام پر قاری کو لے جاتی ہے جہاں اسے ممبئی کی چکا چوند زندگی میں انسان کا وجود ختم ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے ساتھ ہی ،اس ناول میں ذات پات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح اکیسویں صدی میں بھی ابھی کچھ ایسے علاقے ہیں جہاں ایک برہمن کے ساتھ اس سے نچلی ذات والا شادی نہیں کر سکتا ہے۔ ناول میں بے شمار واقعات ہیں لیکن ہر واقعہ آخر میں مرد اور عورت کے اس جسمانی رشتے پر ختم ہوتا ہے جس کی پایۂ تکمیل کے لئے پورے ناول میں ہر کردار ہر کسی کے ساتھ بے وفائی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ جب اسرار اس پر غور کرتا ہے تو اس پر عجیب کیفیت طاری ہوتی ہے لیکن جب وہ خود کو ٹٹولنا شروع کرتا ہے اُسے احساس ہوتا ہے کہ وہ بھی اس بے وفائی کا برابر کا شریک ہے اور بالآخر یہی نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ بے وفائی انسان کی فطرت میں ہے بلکہ فطرت کا سب سے اہم عنصر ہے۔

مجموعی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رحمٰن عباس کا یہ ناول اکیسویں صدی کا اہم ناول ہے جو اپنے موضوع کے لحاظ سے متنازعہ بھی ہے لیکن اگر ناول کا بغور مطالعہ کیا جائے تو صاف ظاہر ہوگا کہ رحمٰن عباس نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہمارے ہی سماج کا حصہ ہے اور اس نے کوئی ایسی بات نہیں لکھی ہے جو ہمارے اردگرد موجود نہ ہو اور موجودہ معاشرے میں اس طرح کے واقعات در پردہ موجود ہیں لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ان واقعات اور حالات کو کھل کر اظہار کا جامہ پہنایا ۔ناول پلاٹ ،موضوع ،منظر نگاری ، جزئیات نگاری ،اسلوب کے اعتبار سے بھی کامیاب ہے ۔ ناول فلیش بیک کی تکنیک میں لکھا گیا اور مختلف مقامات پر ناول ماضی ، حال اور مستقبل میں ڈھلتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن مصنف کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے ماضی سے حال اور حال سے مستقبل کا رشتہ ہر جگہ استوار رکھا ہے ۔اس میں کوئی شک نہیں کہ زیر بحث ناول ،ناول کے میدان میں ایک اہم اضافہ ہے بقول گوپی چند نارنگ 'روحزن اردو ناول نگاری میں ایک اہم موڑ ہے ۔دراصل یہ وہی موڑ ہے جس نے نہ صرف ناول کو نئی سمت بخشی بلکہ مصنف کو بھی ایک نئی بلندی سے روشناس کرایا اس ناول پر گفتگو کرتے ہوئے فاضل جمیلی لکھتے ہیں ۔روحزن سے گزرے بغیر اردو ناول کے تجریدی ارتقاء کو سمجھنا اور ناول نگاری کے نئے معیارات کا تعین انتہائی مشکل ہے۔

ریسرچ اسکالر
شعبہ اردو جموں یونی ورسٹی

رابطہ: partaprajput4444@gmail.com

☆☆☆☆

سعید سہروردی کا مختصر تعارف

اور ان کے افسانوی مجموعے " لکیریں اور خاکے " کا تنقیدی تجزیہ

امر ناتھ راھگیر

سعید سہروردی کی پیدائش 9 اگست 1932ء کو مرزا پور، اتر پردیش میں ہوئی اور وفات 10 مارچ، 2017ء کو میور وہار، دہلی میں ہوئی ۔ابتدائی تعلیم مرزا پور اور ایم ۔اے۔ (معاشیات) کی تعلیم الہ آباد یونیورسٹی سے حاصل کی۔ 1960ء میں دہلی آمد کے بعد انہوں نے کئی سفارت خانوں میں ملازمتیں کیں۔ اردو صحافت سے دلچسپی کے باعث کئی رسالوں کے معاون مدیر رہے۔ طویل عرصے تک روزنامہ قومی آواز، راشٹریہ سہارا، خبریں، میرا وطن اور ہفت روزہ "خبردار" کے لیے کالم لکھتے رہے ۔انہوں نے سماچار بھارتی کے اردو مدیر کے طور پر بھی کام کیا۔ ادارہ شمع سے نکلنے والے ماہنامہ "شبستاں" کے معاون مدیر رہے اور یادگار "فیض نمبر" مرتب کیا۔ سعید سہروردی نے جمعیۃ علماء ہند کی چالیس سال سے زیادہ خدمات انجام دیں ۔انہیں 2003 میں اردو اکادمی، دہلی نے صحافت کے لیے ایوارڈ سے نوازا۔ سعید سہروردی اردو کے ماہر معاشیات، صحافی ،شاعر ،نقاد، مترجم اور افسانہ نگار تھے ۔انگریزی زبان پر قدرت رکھتے تھے اور ترجمہ نگاری میں ماہر تھے ۔انگریزی کی مشہور کتاب کا ترجمہ اردو میں "آدھی رات کی آزادی" کے عنوان سے کیا۔ اس کے علاوہ اردو میں "مسلمانوں کے اقتصادی مسائل اور ان کا حل" عنوان سے کتاب لکھی ۔طنزیہ تحریروں کا مجموعہ "چوہے کے خطوط بلی کے نام"، نظموں کا مجموعہ "سلگتا صندل"، قطعات کے دو مجموعے "پنکھڑیاں" اور "سنگ ریزے" شائع ہو چکے ہیں۔ سعید سہروردی کا پہلا افسانوی مجموعہ " لکیریں اور خاکے "1977ء اور دوسرا " کچھ پھول کچھ پتھر" 1988ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے افسانوی مجموعے " لکیریں اور خاکے " میں 12 افسانے ہیں، جن کا موضوعاتی تنقیدی تجزیہ درجہ ذیل ہے۔

" لکیریں اور خاکے" مجموعے کے پہلے افسانے میں متوسط طبقے کے میاں بیوی کی چھوٹی چھوٹی خواہشات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ افسانہ دو اہم کرداروں شوکت اور اس کی بیوی رضیہ کے اردگرد گھومتا ہے۔ شوکت کو تین سو روپے بونس ملتا ہے اور وہ رضیہ سے گھومنے کی فرمائش کرتا ہے ۔لیکن رضیہ ڈاک خانہ میں مستقبل میں صحیح استعمال کے لیے رقم جمع کرنے کے لیے کہتی ہے ۔شوکت

شعبہ اردو، جموں یونیورسٹی، جموں

DEPARTMENT OF URDU, UNIVERSITY OF JAMMU, JAMMU.

CERTIFICATE

This is to certify that Mr./Ms./Prof./Dr. ......Partap Singh......

of ......Dept. of Urdu, Univ. of Jammu......

has participated/presented a research paper entitled

"......Rahman Abbas Ke Novel mein Mushtarka Tahzeeb......"

in the two day International Seminar on "Urdu Literature and Composite Culture" on 24 & 25, November 2018, Organized by the Department of Urdu, University of Jammu, Jammu.

Prof. Shohab Inayat Malik
Head Department of Urdu
University of Jammu

POST GRADUATE DEPARTMENT OF URDU
UNIVERSITY OF JAMMU A+

شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی

Reg. No. 61

One Day National Seminar
"FIRAQ GORAKHPURI'S POETRY AND INDIAN CIVILIZATION"
21 December 2021

ایک روزہ قومی سیمینار
"فراق گورکھپوری کی شاعری اور ہندوستانی تہذیب"
۲۱/ دسمبر ۲۰۲۱ء

Certificate

This is to Certify that Dr/Mr./Ms. Partap Singh Department of Urdu of (Name of Institution) Deptt. of Urdu, JU Participated/ Presented Paper/Delivered Talk on the Topic Firaq Gorakhpuri Bahaisiat Naqqad. in one day National Seminar organized by the P. G. Department of Urdu, University of Jammu, on 21st December, 2021.

Prof. Mohd. Reyaz Ahmad
H.O.D. Urdu, University of Jammu